جُمادی الاُخریٰ ۱۴۴۰ھ
فروری ۲۰۱۹ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- وضاحتِ ایمان اور دعوتِ ایمان
- فہمِ قرآن —— ایک تشنہ پہلو
- امریکی افواج کا انخلاء اور گریٹر اسرائیل

داعی رجوع الی القرآن، بانی تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن
ترجمہ و مختصر تفسیر

خاص ایڈیشن
دیدہ زیب ٹائٹل • امپورٹڈ آفسٹ پیپر • بڑے سائز میں
عمدہ طباعت • مضبوط جلد
سات جلدوں پر مشتمل
مکمل سیٹ کی قیمت: 4000 روپے

عوامی ایڈیشن
کتابی سائز • پیپر بیک بائنڈنگ • امپورٹڈ بک پیپر
عمدہ طباعت • دیدہ زیب ٹائٹل
چھ جلدوں پر مشتمل
مکمل سیٹ کی قیمت: 2200 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 68
شمارہ : 2
جمادی الاُخریٰ 1440ھ
فروری 2019ء
فی شمارہ -/40

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون
- اندرون ملک 400 روپے
- بھارت و بنگلہ دیش 900 روپے
- ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 1200 روپے
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 1500 روپے

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700، فون: 3-35869501
فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org
ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org
ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: "دارالاسلام" ملتان روڈ چوہنگ لاہور
(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 79-35473375 (042)
پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال — 5
ہیں آج کیوں ذلیل......؟ — ادارہ

بیانُ القُرآن — 9
سورۃ صٓ (آیات ۳۰ تا ۸۸) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

انوارِ ہدایت — 28
توبہ کی تاثیر — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

مطالعہ قرآن حکیم — 33
وضاحتِ ایمان اور دعوتِ ایمان — شجاع الدین شیخ

دعوتِ فکر — 43
فہمِ قرآن — ایک تشنہ پہلو — ڈاکٹر محمد سرشار خان

ظروف و احوال — 61
امریکی افواج کا انخلاء اور گریٹر اسرائیل — محمد ندیم اعوان

فقہ و اصولِ فقہ — 73
اصلی اور فرعی مسائل میں
مخالفین کے ساتھ برتاؤ کے فقہی ضابطے (۵) — ڈاکٹر احمد بن سعد الغامدیؒ

یادِ رفتگاں — 87
مولانا محمد منظور نعمانیؒ اور اباجی (۳) — پروفیسر حافظ قاسم رضوان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہیں آج کیوں ذلیل......؟

سنکیانگ کے یغور مسلمانوں پر یقیناً ایک عرصے سے ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں‘ لیکن حال ہی میں مغربی میڈیا نے اچانک ان مظالم کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کرنا شروع کر دیا ہے۔ مغرب کے اصل عزائم کیا ہیں‘ اُن پر ہم بعد میں روشنی ڈالیں گے‘ اِس سے پہلے ہم چاہیں گے کہ قارئین کا یغور مسلمانوں سے تعارف کرا دیں اور مغربی میڈیا جو الزامات لگا رہا ہے اُس کی تفصیل بھی عرض کر دیں۔ یغور ترکی النسل ہیں جو مشرقی اور وسطی ایشیا میں آباد ہیں۔ بعض مؤرخین یغور کی تاریخ چھ ہزار چار سو (۶۴۰۰) سال پرانی بتاتے ہیں۔ جب اِس خطہ زمین پر اسلام کا سورج طلوع ہوا تو دنیا کے باقی حصوں کی طرح سنکیانگ بھی منور ہوا‘ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج اَسّی (۸۰) فیصد یغور مسلمان ہیں۔ یغور زیادہ تر سنکیانگ میں رہتے ہیں‘ جہاں ان کی تعداد ایک اندازے کے مطابق دو سوا دو کروڑ کے قریب ہے۔ وسطی ایشیا کی دوسری آبادیوں کی طرح یغور بھی یورپی اور مشرقی ایشیائی آبادیوں سے قربت رکھتے ہیں۔

اب آیئے ان الزامات کی طرف جو مغربی میڈیا یغور مسلمانوں کے حوالے سے چین پر لگا رہا ہے۔ نیویارک ٹائمز کے مطابق چینی حکومت نے دس لاکھ یغور مسلمانوں کو کنسنٹریشن کیمپوں میں رکھا ہوا ہے۔ کنسنٹریشن (concentration camp) کی اصطلاح اِس لیے استعمال کی گئی کیونکہ اسی نام سے موسوم کیمپوں میں نازی جرمنی نے یہودیوں کو رکھا ہوا تھا۔ گویا دنیا کو بتانا مقصود ہے کہ جو سلوک نازی جرمنی نے یہودیوں سے کیا تھا‘ ایسا ہی چینی یغور مسلمانوں سے کر رہے ہیں۔ واشنگٹن پوسٹ رقم طراز ہے کہ چینی حکومت نے اِن دس لاکھ یغور مسلمانوں کے ساتھ دس لاکھ کمیونسٹوں کو آباد کیا ہوا ہے‘ تاکہ اُنہیں اُن کے مذہب سے برگشتہ کیا جائے۔ سوشل میڈیا پر مسلسل یہ خبر چل رہی ہے کہ یتیم خانوں میں یغور بچوں کو لادین بنانے کا کام منظم طریقے سے کیا جاتا ہے۔ پھر یہ کہ چینی حکومت اُنھیں اچھے عہدوں تک پہنچنے نہیں دیتی۔ حتیٰ کہ

یہ کام اُن علاقوں میں بھی ہوتا ہے جنہیں کچھ خودمختاری حاصل ہے۔ چینی حکومت اب تک پانچ ہزار مساجد کو یا تو شہید کر چکی ہے یا انہیں بند کر دیا گیا ہے۔ یغور مسلمان اپنے نام کے ساتھ محمد کا لفظ نہیں لگا سکتے۔ لوگوں کو نماز پڑھنے‘ روزہ رکھنے اور داڑھی رکھنے پر اور عورتوں کو پردہ کرنے پر گرفتاری کا خطرہ رہتا ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں پر حلال کا لیبل لگانا انتہا پسندی سمجھی جاتی ہے جبکہ سور کھانا ماڈریٹ ہونے کی دلیل ہے۔

یغور مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے ظلم وستم سے اہلِ پاکستان کافی حد تک واقف ہیں۔ پاکستان اور چین کی دوستی کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ دوستی ہمالیہ سے بلند‘ سمندر سے گہری اور شہد سے میٹھی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس پس منظر میں ان الزامات کا دس فیصد بھی اگر درست ہے تو یہ قابلِ مذمّت ہے اور پاکستان کو چین کو سمجھانے کی ضرورت ہے کہ اپنے شہریوں سے ایسا رویہ خود چین کے لیے ضرررساں اور اہل پاکستان کے لیے انتہائی تکلیف دہ ہے۔ البتہ ہم پُرزور طریقے سے یہ اعلان بھی کریں گے کہ امریکہ‘ مغرب یا کسی بھی غیر مسلم ملک کو اس معاملے میں مداخلت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پاکستان کے عوام کا یہ کردار ہونا چاہیے کہ وہ حکومت پاکستان پر دباؤ ڈالیں کہ چین جو ہمارا دوست ہے اور انتہائی نازک مواقع پر پاکستان کی مدد کے لیے آگے بڑھا ہے‘ اِس بات پر انتہائی سنجیدگی سے غور کرے اور کم از کم یغور مسلمانوں کو اِس بات کی اجازت تو دے کہ وہ اپنی عبادات اور مذہبی شعائر کو آزادانہ طور پر روبہ عمل لا سکیں۔ پاکستانی عوام اور حکومت دونوں کو ناصحانہ انداز اختیار کرنا چاہیے اور مسلسل یہ کوشش کرنی چاہیے کہ چین میں ہمارے مسلمان بھائی خوش وخرم زندگی گزار سکیں۔ البتہ ہمیں امریکہ اور مغرب کے ہتھکنڈوں سے بھی ہوشیار رہنا ہوگا۔

امریکہ کے اصل عزائم کیا ہیں اور اندر کی بات کیا ہے‘ وہ تو کسی طرح ڈھکی چھپی نہیں۔ اس لیے کہ امریکہ کو اگر یغور مسلمانوں سے حقیقی ہمدردی ہوتی اور واقعتاً اُن کے دکھوں کا احساس ہوتا تو وہ یہ سب کچھ ایک عرصہ پہلے کرتا۔ آج جب امریکہ کو یہ محسوس ہو رہا ہے کہ معاشی اور اقتصادی لحاظ سے جن بن جانے والا چین عسکری اور دفاعی لحاظ سے بھی ایک قوت کے طور پر اُبھر رہا ہے تو وہ اپنی خصلت کے مطابق اپنے مفادات حاصل کرنے کے لیے اُمتِ مسلمہ خاص طور پر پاکستان کے مسلمانوں کے مذہبی جذبات انگیخت کر رہا ہے۔ وہ گزشتہ صدی

کی اُسی تاریخ کو دہرانا چاہتا ہے جب سوویت یونین نے افغانستان پر حملہ کرنے کی حماقت کا ارتکاب کیا تو امریکہ کو یکدم مسلمانوں اور اسلام سے عشق لاحق ہو گیا تھا۔ وہ دنیا بھر میں جہاد جہاد کی پکار لگانے لگا۔ جہادی مسلمانوں کو اکٹھا کیا۔ اُن کی اسلحہ‘ بارود اور نقد رقم سے مدد کی۔ سوویت یونین کو شکست دینے کے لیے جہادی مسلمانوں کو استعمال کیا۔ سوویت یونین پاش پاش ہو گیا اور امریکہ سپریم پاور آف دی ورلڈ بننے میں کامیاب ہو گیا۔ دنیا Unipolar ہو گئی۔ امریکہ دنیا کا شہنشاہ بن گیا تو اس نے اپنا روپ بدل لیا۔ کون نہیں جانتا کہ پھر اِسی امریکہ نے دنیا بھر میں مسلمانوں پر بدترین ظلم ڈھائے۔

اب امریکہ کی اِس عالمی شہنشاہیت کو چین سے خطرہ نظر آ رہا ہے۔ امریکہ جان گیا ہے کہ سی پیک جیسے چین کے منصوبے نہ صرف چین کی اقتصادی قوت کو مزید بڑھا دیں گے بلکہ اِس سے چین کی عسکری قوت میں بھی اضافہ ہوگا اور دنیا کے بہت سے ممالک چین کے زیر اثر آ جائیں گے جس سے امریکہ کے معاشی اور جنگی مفادات کو زبردست زک پہنچے گی۔ لہٰذا ایک بار پھر امریکہ اپنے وسائل اور مسلمانوں کا خون استعمال میں لا کر اپنی عالمی شہنشاہیت کو بحال رکھنا چاہتا ہے۔ بغور مسلمانوں سے اظہارِ ہمدردی کرنے سے پہلے امریکہ اپنے گریبان میں منہ ڈالے یا آئینہ دیکھے تاکہ اُس کو معلوم ہو کہ وہ کس طرح فلسطینی مسلمانوں کے گھر اُجاڑنے‘ اُن کی زندگیاں اجیرن کرنے اور اُن کا خون بہانے میں اسرائیلی درندوں کا پون صدی سے ساتھ دے رہا ہے۔ اُس کی پیٹھ تھپک رہا ہے اور انسانیت سوز حرکات کے ارتکاب میں اسرائیل کی ناجائز مدد کر رہا ہے۔ اقوامِ متحدہ کی انسانی حقوق کی تنظیم اسرائیلی مظالم کی معمولی سی مذمت کرے تو امریکہ اس تنظیم پر دو حرف بھیج کر اُس سے الگ ہو جاتا ہے۔ بھارت کشمیر میں ریاستی دہشت گردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کشمیریوں کی نسل کشی کر رہا ہے جس سے امریکہ اور مغرب چشم پوشی کر رہے ہیں۔ افغانستان اور عراق میں کس طرح امریکہ نے بے گناہ اور معصوم شہریوں کا خون بہایا۔

قصہ مختصر ہم اگرچہ سنکیانگ کے مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کی مذمت کرتے ہیں‘ اُس پر اظہارِ افسوس بھی کرتے ہیں۔ لہٰذا حکومت پاکستان پر دباؤ بھی ڈالیں گے کہ سفارتی طور پر بھرپور کوشش کرے کہ چین اِن مسلمانوں سے اچھا سلوک کرے۔ لیکن ہم ہرگز ہرگز اس

حوالے سے امریکہ کی مداخلت کو قبول نہیں کریں گے اور نہ ہی مغرب کی اکساہٹ پر بندوق اُٹھائیں گے۔ یہ امریکہ کے مذموم مقاصد میں اُس کی مدد کرنے کے مترادف ہوگا۔ ہماری مغرب خاص طور پر امریکہ کے حوالے سے یہ سوچ پختہ ہو چکی ہے کہ اسلام کی تاریخ میں امریکہ سے بڑا مسلمانوں کا کوئی دشمن ثابت نہیں ہوا۔ البتہ اِس یاددہانی کی شدت سے ضرورت ہے کہ آج کا مسلمان‘ چاہے اُس کا تعلق پاکستان سے ہے یا مشرقِ وسطیٰ سے یا افریقہ سے‘ وہ سوچے غور و فکر کرے کہ آج ہم دنیا بھر میں ذلیل و خوار کیوں ہیں‘ کیوں دنیا بھر میں مسلمان ظلم وستم کا شکار ہیں؟ بقول غالبؔ: ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں!

اس ذلت و خواری سے بچنے کا ایک اور صرف ایک حل ہے کہ اٹھاون مسلمان ممالک حقیقی معنوں میں اُمتِ مسلمہ کو وجود میں لائیں‘ قرآن و سنت کی بالادستی کو قبول کر کے دنیا کو ایک بار پھر حقیقی اسلامی ریاست سے روشناس کروائیں اور دنیا کو عدل وقسط سے بھر دیں۔ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے۔ سب ایک اللہ سے ڈریں تاکہ دنیا حقیقت میں امن و امان کا گہوارہ بن جائے۔

❁❁❁

اخلاص فی العبادت اور اقامتِ دین
کی اہمیت و فرضیت ، بعنوان :

توحیدِ عملی

سورۃ الزمر تا سورۃ الشوریٰ کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

اشاعت خاص 150 روپے، اشاعت عام 100 روپے

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃ صٓ

آیات ۳۰ تا ۴۰

وَوَهَبۡنَا لِدَاوٗدَ سُلَيۡمٰنَ ؕ نِعۡمَ الۡعَبۡدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۳۰﴾ اِذۡ عُرِضَ عَلَيۡهِ
بِالۡعَشِىِّ الصّٰفِنٰتُ الۡجِيَادُ ۙ﴿۳۱﴾ فَقَالَ اِنِّىۡۤ اَحۡبَبۡتُ حُبَّ الۡخَيۡرِ عَنۡ ذِكۡرِ رَبِّىۡ ۚ
حَتّٰى تَوَارَتۡ بِالۡحِجَابِ ﴿۳۲﴾ رُدُّوۡهَا عَلَىَّ ؕ فَطَفِقَ مَسۡحًاۢ بِالسُّوۡقِ وَالۡاَعۡنَاقِ ﴿۳۳﴾
وَلَقَدۡ فَتَنَّا سُلَيۡمٰنَ وَاَلۡقَيۡنَا عَلٰى كُرۡسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ﴿۳۴﴾ قَالَ رَبِّ اغۡفِرۡ
لِىۡ وَهَبۡ لِىۡ مُلۡكًا لَّا يَنۡۢبَغِىۡ لِاَحَدٍ مِّنۡۢ بَعۡدِىۡ ۚ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡوَهَّابُ ﴿۳۵﴾
فَسَخَّرۡنَا لَهُ الرِّيۡحَ تَجۡرِىۡ بِاَمۡرِهٖ رُخَآءً حَيۡثُ اَصَابَ ۙ﴿۳۶﴾ وَالشَّيٰطِيۡنَ كُلَّ بَنَّآءٍ
وَّغَوَّاصٍ ۙ﴿۳۷﴾ وَّاٰخَرِيۡنَ مُقَرَّنِيۡنَ فِى الۡاَصۡفَادِ ﴿۳۸﴾ هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامۡنُنۡ اَوۡ
اَمۡسِكۡ بِغَيۡرِ حِسَابٍ ﴿۳۹﴾ وَاِنَّ لَهٗ عِنۡدَنَا لَزُلۡفٰى وَحُسۡنَ مَاٰبٍ ﴿۴۰﴾

آیت ۳۰ ﴿وَوَهَبۡنَا لِدَاوٗدَ سُلَيۡمٰنَ ؕ﴾ ’’اور ہم نے داؤدؑ کو سلیمانؑ (جیسا بیٹا) عطا کیا۔‘‘

﴿نِعۡمَ الۡعَبۡدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۳۰﴾﴾ ’’وہ بہت ہی اچھا بندہ تھا۔ بے شک وہ (ہماری طرف) بڑا ہی رجوع کرنے والا تھا۔‘‘

آیت ۳۱ ﴿اِذۡ عُرِضَ عَلَيۡهِ بِالۡعَشِىِّ الصّٰفِنٰتُ الۡجِيَادُ ﴿۳۱﴾﴾ ’’جب اس کے سامنے پیش کیے گئے شام کے وقت عمدہ نسل کے اصیل گھوڑے۔‘‘

اس سے پہلے ہم سورۃ النمل میں حضرت سلیمانؑ کے عظیم الشان لشکروں کے بارے میں پڑھ چکے ہیں کہ آپؑ کے لشکروں میں انسانوں کے علاوہ جن اور پرندے بھی تھے اور ان سب کو الگ الگ رجمنٹس (regiments) اور دستوں میں منظم کیا گیا تھا۔ اسی طرح سوار فوج (cavalry) کی اہمیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے آپؑ نے اپنے لشکر میں اعلیٰ نسل کے اصیل اور

تیز رو گھوڑوں کے دستوں کا اہتمام بھی کر رکھا تھا اور اُس زمانے میں اصل فوجی طاقت یہی گھوڑے ہوا کرتے تھے۔ سورۃ النمل کی متعلقہ آیات کے مطالعے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ اپنی افواج کے مختلف دستوں کے باقاعدہ معائنے (inspection parade) کا اہتمام بھی فرمایا کرتے تھے: ﴿وَحُشِرَ لِسُلَيۡمٰنَ جُنُوۡدُهٗ مِنَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ وَالطَّيۡرِ فَهُمۡ يُوۡزَعُوۡنَ ﴿۱۷﴾﴾ ’’اور جمع کیے گئے سلیمانؑ کے (معائنہ کے) لیے اس کے لشکر جنوں‘ انسانوں اور پرندوں میں سے‘ اس طرح کہ انہیں جماعتوں میں منظم کیا گیا تھا‘‘۔ چنانچہ ایسے ہی کسی معائنہ کے لیے ایک سہ پہر آپؑ کے سامنے گھوڑوں کے دستے پیش کیے گئے۔ اس مصروفیت میں حضرت سلیمانؑ ایسے مشغول ہوئے کہ سورج غروب ہو گیا اور آپؑ کی نمازِ عصر قضا ہو گئی‘ جیسے غزوۂ احزاب کے موقع پر حضورﷺ کی بھی نمازِ عصر قضا ہو گئی تھی۔ اس پر حضورﷺ نے کافروں پر بایں الفاظ بددعا فرمائی تھی: ((مَلَأَ اللّٰهُ بُيُوْتَهُمْ وَقُبُوْرَهُمْ نَارًا))(۱) ’’اللہ ان کے گھروں اور ان کی قبروں کو آگ سے بھر دے‘‘۔ بہرحال گھوڑوں کی مشغولیت کی وجہ سے حضرت سلیمانؑ کی نمازِ عصر قضا ہو گئی جس کا آپؑ کو بے حد افسوس ہوا۔

آیت ۳۲ ﴿فَقَالَ اِنِّىۡۤ اَحۡبَبۡتُ حُبَّ الۡخَيۡرِ عَنۡ ذِكۡرِ رَبِّىۡ ۚ﴾ ’’تو اُس نے کہا کہ میں نے پسند کر لیا مال کی محبت کو اپنے رب کے ذکر کے مقابلے میں!‘‘

حُبَّ الۡخَيۡرِ سے مال و دولت یعنی گھوڑوں کی محبت مراد ہے کہ میں گھوڑوں کی محبت میں اس قدر مشغول ہو گیا کہ اپنے رب کے ذکر کو بھول گیا۔ اپنے ربّ کی یاد سے غافل ہو گیا۔

﴿حَتّٰى تَوَارَتۡ بِالۡحِجَابِ ﴿۳۲﴾﴾ ’’یہاں تک کہ (سورج) چھپ گیا اوٹ میں۔‘‘

یہاں پر تَوَارَتۡ کے بعد الشَّمۡس (سورج) کا لفظ گویا محذوف ہے۔

آیت ۳۳ ﴿رُدُّوۡهَا عَلَىَّ ؕ فَطَفِقَ مَسۡحًاۢ بِالسُّوۡقِ وَالۡاَعۡنَاقِ ﴿۳۳﴾﴾ ’’(تو اُس نے کہا:) واپس لاؤ ان کو میرے پاس! تو اب وہ لگا تلوار مارنے ان کی ٹانگوں اور گردنوں پر۔‘‘

یعنی آپؑ کو نماز قضا ہونے کا اس قدر افسوس تھا کہ آپؑ نے گھوڑوں کو واپس منگوایا اور شدید تاثر اور مغلوبیت کی کیفیت میں ان کی گردنوں اور ٹانگوں پر تلوار سے وار کرنا شروع کر دیے۔ یہاں پر بعض مفسرین نے مَسۡحًا سے ’’ہاتھ پھیرنا‘‘ مراد لے کر آیت کی یہ تاویل کی

---

(۱) صحيح البخاری‘ كتاب الجهاد والسير‘ باب الدعاء على المشركين بالهزيمة والزلزلة۔ وصحيح مسلم‘ كتاب المساجد ومواضع الصلاة‘ باب التغليظ فى تفويت صلاة العصر۔

ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے دراصل گھوڑوں کی کارکردگی سے خوش ہو کر انہیں واپس منگوایا تھا اور جب گھوڑے واپس لائے گئے تو آپؑ ان کی گردنوں اور ٹانگوں کو پیار سے سہلاتے رہے' یعنی ان سے اظہارِ محبت کے طور پر ان پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ لیکن آیت کے الفاظ اور سیاق و سباق کے مطابق پہلا مفہوم ہی درست معلوم ہوتا ہے۔

یہاں پر اس نکتہ کی وضاحت بھی بہت ضروری ہے کہ حضرت سلیمانؑ کا مذکورہ عمل دراصل غلبہ حال کے تحت تھا۔ جیسے حضرت عمرؓ غزوۂ اُحد میں رسول اللہ ﷺ کی شہادت کی خبر سن کر تلوار پھینک کر بیٹھ گئے تھے کہ اب کس کے لیے لڑنا ہے؟ حالانکہ اُنؓ کا جہاد و قتال تو اللہ کے لیے تھا' نہ کہ حضرت محمد ﷺ کے لیے۔ اسی طرح حضور ﷺ کے انتقال کے موقع پر بھی حضرت عمرؓ نے غلبۂ حال کے سبب تلوار کھینچ لی کہ جس کسی نے کہا کہ حضورؐ انتقال کر گئے ہیں میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔ اس انتہائی نازک صورتِ حال کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سنبھالا۔ آپؓ نے اس موقع پر ایک خطبہ دیا اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا: **مَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ، وَمَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ** ''جو کوئی محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا تو وہ سن لے کہ محمد ﷺ کا انتقال ہو چکا ہے اور جو کوئی اللہ کی بندگی کرتا تھا تو وہ جان لے کہ اللہ زندہ ہے اور اس پر کبھی موت واقع نہیں ہوگی''۔ اس کے بعد آپؓ نے سورۂ آلِ عمران کی یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۴۴)(۱)۔ بہرحال غلبۂ حال کی کیفیت میں کبھی کبھی بڑی شخصیات سے بھی غیر معمولی افعال اور غیر متوقع رویے کا صدور ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت سلیمانؑ کا اپنی نماز قضا ہونے کے رنج میں غلبۂ حال کی غیر معمولی کیفیت کے تحت گھوڑوں پر تلوار سے وار کرنا بعید از فہم نہیں ہے۔

آیت ۳۴ ﴿وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ﴿٣٤﴾﴾ ''اور (اسی طرح) ہم نے آزمائش میں ڈالا سلیمانؑ کو' اور اس کے تخت پر ہم نے ایک جسد ڈال دیا' پھر اُس نے رجوع کیا۔''

اس واقعہ کے بارے میں ایک مرفوع حدیث موجود ہے۔ واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ایک موقع پر اپنے سپہ سالاروں سے غصے کی کیفیت میں کہا کہ تم مت

(۱) صحیح البخاری' کتاب المغازی' باب مرض النبی ﷺ اور دیگر ابواب۔

سمجھو کہ میرا اقتدار اور میری طاقت تم لوگوں کے بل پر قائم ہے۔ میں آج رات اپنی تمام بیویوں کے پاس جاؤں گا اور ان سب سے بیٹے پیدا ہوں گے جو بڑے ہو کر میرے دست بازو بنیں گے۔ لیکن آپؑ یہ کہتے ہوئے ''ان شاء اللہ'' کہنا بھول گئے۔ چنانچہ آپؑ کی تمام ازواج میں سے صرف ایک کو حمل ہوا اور اس حمل سے بھی ایک ناقص الخلقت بچہ پیدا ہوا جو دایہ نے لا کر آپؑ کے تخت پر رکھ دیا۔ حضرت سلیمانؑ نے جو بات کہی تھی اس کا شاید دربار میں چرچا بھی ہو گیا تھا' چنانچہ اس موقع پر انہیں سبکی بھی اٹھانی پڑی۔

ایسا ہی معاملہ ایک مرتبہ حضور ﷺ کے ساتھ بھی پیش آیا تھا۔ آپؐ سے مشرکینِ مکہ نے اصحابِ کہف اور ذوالقرنین کے بارے میں پوچھا تو آپؐ نے فرمایا کہ میں آپ لوگوں کو ان کے بارے میں کل بتاؤں گا۔ مگر یہ کہتے ہوئے آپؐ ''ان شاء اللہ'' کہنا بھول گئے۔ حضرت جبرائیلؑ روزانہ ہی آپؐ کے پاس آتے تھے اور آپؐ کا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ راہنمائی کے لیے وحی بھیج دیں گے' مگر اس کے بعد کئی روز تک وحی نہیں آئی۔ ظاہر ہے یہ صورتِ حال آپ ﷺ کے لیے بہت تکلیف دہ تھی۔ مشرکین بار بار آپؐ کے پاس آ کر مطالبہ کرتے ہوں گے اور تالیاں پیٹتے ہوں گے کہ کیا ہوا آپؐ کے علم کو؟ اور کہاں رہ گئی آپؐ کی وحی؟ پھر جب کئی روز کے بعد سورۃ الکہف نازل ہوئی تو اس میں مذکورہ سوالات کے جوابات کے ساتھ یہ آیات بھی نازل ہوئیں: ﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿٢٣﴾ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۫ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَقُلْ عَسٰۤى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿٢٤﴾﴾ ''اور کسی چیز کے بارے میں کبھی یہ نہ کہیں کہ میں یہ کام کل ضرور کر دوں گا مگر یہ کہ اللہ چاہے! اور اپنے رب کو یاد کر لیا کیجیے جب آپ بھول جائیں اور کہیے: ہو سکتا ہے کہ میرا رب میری راہنمائی کر دے اس سے بہتر بھلائی کی طرف۔''

ایسے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے مقرب بندوں کا چھوٹی چھوٹی فروگزاشتوں پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مواخذہ ہوتا ہے' جبکہ عام لوگوں کی بڑی بڑی غلطیوں کو بھی نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ بہرحال حضرت سلیمانؑ مذکورہ بات کہتے ہوئے ''ان شاء اللہ'' کہنا بھول گئے۔ بلکہ روایت میں تو یہ بھی ہے کہ اس موقع پر فرشتے نے آپؑ کو یاد بھی کرایا مگر جذبات کی کیفیت میں آپؑ اس کا اہتمام نہ کر سکے۔ البتہ تنبیہ کے بعد پر آپؑ نے فوری طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر لیا۔

آیت ۳۵ ﴿قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿٣٥﴾﴾ ''اُس نے دعا کی: پروردگار! مجھے معاف فرما دے اور مجھے ایسی حکومت عطا فرما جو میرے بعد کسی اور کے لیے سزاوار نہ ہو‘ یقیناً تو ہی عطا فرمانے والا ہے۔''

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپؑ کی یہ دعا قبول فرماتے ہوئے آپؑ کو جنوّں‘ پرندوں اور ہواؤں پر بھی حکومت عطا فرمائی اور ایسی حکومت آپؑ کے بعد پھر کسی اور کو نصیب نہ ہوئی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اور آپؑ کے والد حضرت داؤد علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے جو خصوصی انعامات اور احسانات فرمائے تھے ان کے بارے میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے جذباتِ شکر کا اظہار آپؑ کی اس دعا سے بھی ہوتا ہے: ﴿وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٩﴾﴾ (النمل) ''اور اُس نے دعا کی: پروردگار! مجھے توفیق دے کہ میں شکر ادا کروں تیری اس نعمت کا جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا کی ہے اور یہ کہ میں اچھے اعمال کروں جن سے تو راضی ہو‘ اور مجھے داخل کرنا اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں۔''

آیت ۳۶ ﴿فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَاۗءً حَيْثُ اَصَابَ ﴿٣٦﴾﴾ ''تو ہم نے اُس کے لیے ہوا کو بھی مسخر کر دیا‘ وہ اُس کے حکم سے چلتی تھی بہت نرمی سے‘ جہاں کہیں کا وہ قصد کرتا۔''

ہوا کے چلنے کا رخ متعین کرنا بھی آپؑ کے اختیار میں تھا۔ چنانچہ ہوا آپؑ کی مرضی سے آپؑ کو اور آپؑ کے سفیروں کو خشکی اور سمندر کی مسافتیں طے کراتی تھی۔

آیت ۳۷ ﴿وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّاۗءٍ وَّغَوَّاصٍ ﴿٣٧﴾﴾ ''اور سرکش جنّات کو بھی (ہم نے مسخر کر دیا تھا) سب کے سب عمارتیں بنانے والوں اور غوطہ خوروں کو۔''

حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے یہ جنّات بڑی بڑی عمارتیں بناتے تھے اور سمندر کی تہہ سے موتی اور دیگر اشیاء نکالتے تھے ـــــ بَنَّـــاء کے معنی معمار کے ہیں۔ حسن البناء شہید رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی وجہ سے ''البناء'' کہلاتے تھے کہ ان کا تعلق ایک معمار خاندان سے تھا۔ عرب معاشرے میں کسی بھی پیشے کو حقیر یا باعث عار نہیں سمجھا جاتا۔ بقول غالب ع ''پیشے کو عیب نہیں‘ رکھیے نہ فرہاد کو نام!'' چنانچہ عربوں کے ہاں اگر کسی شخص کے آباء واَجداد حرم میں لوگوں کو پانی پلایا کرتے تھے تو وہ آج بھی ''سقّاء'' کہلاتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کا تعلق نانبائیوں

کے خاندان سے ہے تو وہ ''خبّاز'' کہلوانے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔

آیت ۳۸ ﴿وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿٣٨﴾﴾ ''اور دوسرے جنّات کو بھی جو جکڑے ہوئے تھے زنجیروں میں۔''

یعنی کچھ جنّات کو تو آپؑ نے کام پر لگایا ہوتا تھا جبکہ بعض دوسروں کو زنجیروں میں باندھ کر رکھا جاتا تھا کہ کہیں اچانک ضرورت پڑنے پر ان سے کام لیا جا سکے۔

آیت ۳۹ ﴿هٰذَا عَطَاۗؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٣٩﴾﴾ ''یہ ہماری عطا ہے‘ پس تم چاہو تو لوگوں پر احسان کرو یا اپنے پاس روکے رکھو‘ اس پر کوئی حساب نہیں۔''

ہم نے سلیمانؑ سے کہہ دیا تھا کہ ہم نے جو نعمتیں تمہیں عطا کر رکھی ہیں ان میں سے جو چاہو لوگوں میں تقسیم کرو اور جو چاہو اپنے پاس رکھو۔ نیز جس کو چاہو دو اور جس کو چاہو نہ دو۔ اس معاملے میں آپؑ سے کوئی حساب نہیں لیا جائے گا۔

آیت ۴۰ ﴿وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿٤٠﴾﴾ ''اور اُس کے لیے ہمارے پاس مقامِ قرب بھی ہے اور بہت عمدہ ٹھکانہ بھی۔''

جب وہؑ لوٹ کر ہمارے پاس آئے گا تو اسے مقامِ قرب‘ بہت بلند مراتب اور بڑے بڑے انعامات سے نوازا جائے گا۔

آیات ۴۱ تا ۶۴

وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ
وَّعَذَابٍ ؕ﴿٤١﴾ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ﴿٤٢﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ
اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿٤٣﴾ وَخُذْ
بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ؕ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ
اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴿٤٤﴾ وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ
وَالْاَبْصَارِ ﴿٤٥﴾ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ۚ﴿٤٦﴾ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ
الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ؕ﴿٤٧﴾ وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ؕ وَكُلٌّ مِّنَ
الْاَخْيَارِ ؕ﴿٤٨﴾ هٰذَا ذِكْرٌ ؕ وَاِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ ۙ﴿٤٩﴾ جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً

لَّهُمُ الْاَبْوَابُ ﴿۵۰﴾ مُتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ وَّشَرَابٍ ﴿۵۱﴾
وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ ﴿۵۲﴾ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۵۳﴾
اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ﴿۵۴﴾ هٰذَا ؕ وَاِنَّ لِلطّٰغِيْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ﴿۵۵﴾
جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۵۶﴾ هٰذَا ۙ فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ ﴿۵۷﴾
وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖۤ اَزْوَاجٌ ﴿۵۸﴾ هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ۚ لَا مَرْحَبًا ۢ بِهِمْ ؕ
اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ﴿۵۹﴾ قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ ۟ لَا مَرْحَبًا ۢ بِكُمْ ؕ اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا ۚ
فَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِي
النَّارِ ﴿۶۱﴾ وَقَالُوْا مَا لَنَا لَا نَرٰى رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ ﴿۶۲﴾ اَتَّخَذْنٰهُمْ
سِخْرِيًّا اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُ ﴿۶۳﴾ اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ ﴿۶۴﴾

آیت ۴۱ ﴿وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ﴿۴۱﴾﴾ ’’اور ذرا یاد کیجیے ہمارے بندے ایوبؑ کو' جبکہ اُس نے پکارا اپنے رب کو کہ مجھے شیطان نے شدید بیماری اور تکلیف میں مبتلا کر دیا ہے۔‘‘

حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری اور ان کا صبر مشہور ہے۔ آپؑ کسی جلدی مرض میں مبتلا ہو گئے تھے جس کی وجہ سے آپؑ کا سارا جسم گل گیا تھا۔ مال و دولت بھی سب جاتا رہا' اعزہ و اقرباء منہ موڑ گئے' آل و اولاد میں سے کچھ فوت ہو گئے اور کچھ آپ کو چھوڑ کر چلے گئے۔ آخر کار ایک بیوی ساتھ رہ گئی تھی جو اس بیماری سے اکتانے لگی۔ (واضح رہے کہ شر یا ایذا وغیرہ کو شیطان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ مراد نہیں کہ شیطان کو تکلیف پہنچانے کی قدرت حاصل ہے۔)

آپؑ نے انتہائی کس مپرسی کی حالت میں مذکورہ بالا دعا کی تو جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

آیت ۴۲ ﴿اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ﴿۴۲﴾﴾ ’’ذرا اپنا پاؤں زمین پر مارو' یہ (چشمہ جو جاری ہوا ہے) ٹھنڈا پانی ہے غسل کے لیے ہے اور پینے کے لیے۔‘‘

آپؑ کے ایڑی مارنے پر زمین سے ٹھنڈے پانی کا چشمہ اُبل پڑا۔ اس پانی میں اللہ تعالیٰ نے آپؑ کے لیے ایسی شفا رکھ دی کہ اس سے نہانے اور اس کو پینے سے آپؑ صحت یاب ہو گئے۔ ممکن ہے اس پانی میں گندھک کے اثرات ہوں۔ ایسے چشمے بعض مقامات پر آج بھی

دیکھنے میں آتے ہیں جن میں نہانے سے جلدی امراض کے مریض شفایاب ہو جاتے ہیں۔

آیت ۴۳ ﴿وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ﴾ ’’اور ہم نے اسے اُس کے اہل و عیال بھی عطا کر دیے اور ان کے ساتھ ویسے ہی (اہل و عیال) مزید بھی دیے‘‘

یعنی آپؑ کے اہل و عیال آپؑ کے پاس واپس آ گئے اور اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو مزید اولاد سے بھی نوازا۔

﴿رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۴۳﴾﴾ ’’یہ سب ہماری طرف سے رحمت کا مظہر تھا' اور یاد دہانی تھی ہوش مند لوگوں کے لیے۔‘‘

آیت ۴۴ ﴿وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ؕ﴾ ’’اور تم لے لو اپنے ہاتھ میں تنکوں کا ایک مُٹھا' تو اس سے ایک ضرب لگا دو' اور قسم نہ توڑو!‘‘

حضرت ایوب علیہ السلام کسی موقع پر اپنی بیوی سے ناراض ہوئے تو آپؑ نے غصے میں قسم کھالی کہ آپؑ انہیں سو کوڑے ماریں گے۔ اب جب کہ آپؑ صحت مند ہو گئے تو آپؑ فکرمند تھے کہ اب قسم پوری کرنے کی کیا ترکیب کریں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپؑ کی راہنمائی کرتے ہوئے ایک طریقہ بتا دیا کہ آپؑ سو تنکے لے کر ان کو باندھ کر ایک جھاڑو سا بنا لیں اور اس سے اپنی بیوی کو ایک ضرب لگا دیں۔ اس طرح آپؑ کی قسم پوری ہو جائے گی اور آپؑ کی اہلیہ کو تکلیف بھی نہیں ہو گی۔

﴿اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴿۴۴﴾﴾ ’’یقیناً ہم نے اسے صابر پایا' بہت ہی خوب بندہ۔ یقیناً وہ (ہماری طرف) بڑا ہی رجوع کرنے والا تھا۔‘‘

آیت ۴۵ ﴿وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ﴿۴۵﴾﴾ ’’اور تذکرہ کیجیے ہمارے بندوں ابراہیمؑ' اسحاقؑ اور یعقوبؑ کا' جو قوت والے اور بصیرت والے تھے۔‘‘

آیت ۴۶ ﴿اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ﴿۴۶﴾﴾ ’’ہم نے ان کو خالص کر لیا تھا ایک خالص شے' یعنی آخرت کے گھر کی یاد دہانی کے لیے۔‘‘

ان لوگوں کی زندگی کا ایک یہی مقصد تھا کہ وہ ہمیشہ لوگوں کو آخرت کی زندگی کی طرف متوجہ کرتے رہتے تھے۔ اس حوالے سے یہ بات میں بار ہا عرض کر چکا ہوں کہ اللہ کا جو بندہ اس

مقام پر پہنچ جاتا ہے اسے دنیا کے مال و دولت اور دوسری چیزوں میں کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ زندگی میں اگر اس کا کوئی ہدف ہوتا ہے تو بس یہی کہ وہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلائے‘ انہیں آخرت کے برے انجام سے بچائے۔ پھر اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اسی ہدف کے لیے صرف ہوتا ہے اور اس کی تمام تر صلاحیتیں اسی مشن کے لیے وقف ہو جاتی ہیں۔ حضرت شیخ معین الدین اجمیری ؒ کی مثال لے لیجیے۔ آپؒ یہی مشن لے کر اجمیر پہنچے تھے۔ اجمیر اس زمانے میں ہندو راجپوتوں کا مرکزی شہر اور کفر کا گڑھ تھا۔ حضرت شیخ علی ہجویری ؒ تو لاہور اس وقت تشریف لائے تھے جب یہ علاقہ اسلامی حکومت میں شامل ہو چکا تھا‘ لیکن حضرت معین الدینؒ نے اس شہر کو اپنا ٹھکانہ بنایا جو اس وقت مکمل طور پر کفر و شرک کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ بہرحال آپؒ اپنا گھر بار چھوڑ کر کوئی کاروبار کرنے کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے کے لیے آئے تھے اور یہی آپؒ کی زندگی کا مقصد اور مشن تھا۔

آیت ۴۷ ﴿وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ﴿٤٧﴾﴾ ”اور یقیناً وہ ہمارے نزدیک چُنے ہوئے اور نیک لوگوں میں سے ہیں۔“

گویا جو شخص لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے اور اس کے دین کی دعوت کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر دیتا ہے اور اس کا جینا مرنا اسی مقصد کے لیے ہوتا ہے‘ وہ اللہ کے نزدیک مُصْطَفَيْن (چنیدہ اور برگزیدہ افراد) میں سے ہو جاتا ہے۔

آیت ۴۸ ﴿وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ۭ وَكُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ ﴿٤٨﴾﴾ ”اور ذکر کیجیے اسماعیلؑ‘ الیسعؑ اور ذوالکفلؑ کا‘ یہ سب بھی بہت عمدہ لوگوں میں سے تھے۔“

حضرت الیسع اور حضرت ذوالکفل علیہما السلام کے بارے میں آج ہمیں یقینی معلومات میسر نہیں۔ سورۃ الانبیاء (آیت ۸۵) کی تشریح کے ذیل میں مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کا یہ خیال نقل کیا گیا تھا (اور مجھے اس سے کسی حد تک اتفاق ہے) کہ قرآن میں ذوالکفلؑ کے نام سے جس پیغمبر کا ذکر ہوا ہے وہ دراصل گوتم بدھ تھے۔ ان کا اصل نام سدھارتا تھا۔ ”گوتم بدھ“ یا ”گوتما بدھا“ ان کا لقب تھا جو بعد میں مشہور ہوا۔ آپ ریاست ”کپل وستو“ کے ولی عہد تھے۔ چنانچہ جن محققین کا خیال ہے کہ قرآن میں ذوالکفل کے نام سے گوتم بدھ ہی کا ذکر ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ ”کفل“ دراصل ”کپل“ ہی کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ یعنی ہندی ”پ“ کی جگہ عربی کی ”ف“ نے لے لی ہے اور اس طرح گویا ذوالکفل کے معنی ہیں ”کپل

(ریاست) والا“۔☆

آیت ۴۹ ﴿هٰذَا ذِكْرٌ ۭ وَاِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿٤٩﴾﴾ ”یہ ایک ذکر ہے‘ اور یقیناً متقین کے لیے بہت ہی اچھی لوٹنے کی جگہ ہے۔“

آیت ۵۰ ﴿جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ ﴿٥٠﴾﴾ ”(یعنی) رہنے والے باغات جن کے دروازے ان کے لیے کھلے رکھے جائیں گے۔“

اہلِ جنت کے لیے جنت کے دروازے کھلے رکھے جانے کا ذکر سورۃ الزمر کے آخری رکوع میں بھی آیا ہے‘ بلکہ وہاں اس حوالے سے اہلِ جنت اور اہلِ جہنم کے استقبال کا فرق اس طرح واضح کیا گیا ہے کہ اہل جنت کے لیے تو جنت کے دروازے پہلے سے ہی کھلے ہوں گے۔ جیسے کسی مہمان کا انتظار کھلے دروازوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یعنی جس مہمان کا باقاعدہ انتظار ہو اس کے لیے یوں نہیں ہوتا کہ پہلے دروازہ بند ہو اور اس کے آنے پر ہی اسے کھولا جائے۔ چنانچہ جنتی مہمانوں کے لیے جنت کے دروازوں کو پہلے سے ہی کھول کر رکھا جائے گا۔ اس کے برعکس اہل جہنم کو ہانک کر جب جہنم کے دروازے پر لے جایا جائے گا تب دروازوں کو کھولا جائے گا۔ یہ اس لیے کہ جہنم کی مثال جیل کی سی ہے اور جیل کے دروازوں کو معمول کے مطابق بند رکھا جاتا ہے۔ البتہ جب کوئی نیا مجرم آتا ہے تو اسے داخل کرنے کے لیے اس کے کھولنے کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔

آیت ۵۱ ﴿مُتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ وَّشَرَابٍ ﴿٥١﴾﴾ ”اس میں وہ تکیے لگا کر بیٹھے ہوں گے‘ طلب کریں گے اس میں میوے بہت سے اور مشروبات بھی۔“

آیت ۵۲ ﴿وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ ﴿٥٢﴾﴾ ”اور ان کے پاس ہوں گی (ان کی بیویاں) نیچی نگاہوں والی‘ ان کی ہم عمر۔“

آیت ۵۳ ﴿هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿٥٣﴾﴾ ”یہ کچھ ہے جس کا تم سے وعدہ کیا

☆ سورۃ الانبیاء (آیت ۸۵) کی تشریح میں حضرت ذوالکفل علیہ السلام کا بایں طور تذکرہ ملاحظہ کرنے کے بعد ”بیان القرآن“ کے ایک قاری نے توجہ دلائی ہے کہ جنوبی عراق میں (نجف اور الحلّہ کے درمیان) ”الکفل“ نام کا ایک قصبہ موجود ہے‘ جہاں ایک مزار کو حضرت ذوالکفل علیہ السلام کی قبر سے موسوم کیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم! (حاشیہ از مرتب)

جا رہا ہے حساب کے دن کے لیے!‘‘

آیت ۵۴ ﴿اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ﴿٥٤﴾﴾ ’’یہ ہیں ہماری عطا کی ہوئی چیزیں‘ جو کبھی ختم نہیں ہوں گی۔‘‘

آیت ۵۵ ﴿هٰذَا ؕ وَاِنَّ لِلطّٰغِیْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ﴿٥٥﴾﴾ ’’(متقین کے لیے تو) یہ ہے! اور یقیناً سرکشوں کے لیے لوٹنے کی بہت بری جگہ ہے۔‘‘

آیت ۵۶ ﴿جَهَنَّمَ ۚ یَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿٥٦﴾﴾ ’’(یعنی) جہنم‘ جس میں وہ داخل ہوں گے‘ پس وہ بہت ہی برا بچھونا ہوگا۔‘‘

آیت ۵۷ ﴿هٰذَا ۙ فَلْیَذُوْقُوْهُ حَمِیْمٌ وَّغَسَّاقٌ ﴿٥٧﴾﴾ ’’یہ ہے (ان کے لیے)‘ پس اس کو چکھیں‘ کھولتا ہوا پانی اور پیپ!‘‘

جہنم میں لے جا کر اہل جہنم سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ جگہ جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ اب اس میں رہو اور اس کے عذاب کو برداشت کرو۔ اس میں ان کو کھولتے ہوئے پانی اور زخموں کے خون اور پیپ کا مزہ بھی چکھنا ہوگا۔ گویا انہیں کھانے اور پینے کے لیے ایسی چیزیں دی جائیں گی جن کو انسان کی طبیعت بہت ناگوار محسوس کرتی ہے۔ اعاذنا اللّٰہ من ذٰلک!

آیت ۵۸ ﴿وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖۤ اَزْوَاجٌ ﴿٥٨﴾﴾ ’’اور اسی طرح کی کئی دوسری چیزیں بھی۔‘‘

اور اسی طرح کی مزید خوفناک‘ گندی اور بدذائقہ چیزیں بھی اہل جہنم کو کھانے اور پینے کے لیے دی جائیں گی۔

آیت ۵۹ ﴿هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ۚ﴾ ’’یہ ایک فوج ہے جو تمہارے ساتھ دھنسی چلی آرہی ہے۔‘‘

جہنم میں پہلے سے موجود لوگ ہر نئے آنے والے گروہ کے بارے میں یوں کہیں گے کہ ہم تو پہلے ہی یہاں انتہائی مصیبت میں ہیں۔ جگہ بھی تنگ ہے‘ گرمی اور حبس بھی بہت ہے اور اوپر سے تم بھی ہمارے اوپر دھنسے چلے آرہے ہو۔

﴿لَا مَرْحَبًۢا بِهِمْ ؕ﴾ ’’ان کے لیے کوئی کشادگی نہ ہو!‘‘

یعنی یہ جو نئی کھیپ آرہی ہے ان کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں۔ ’’مرحبا‘‘ کے لغوی معنی فراخی اور کشادگی کے ہیں۔ یہ کسی کو خوش آمدید کہنے کا کلمہ (greeting) ہے۔ یعنی آیئے

آیئے! آپ کے لیے یہاں بہت جگہ اور ہر قسم کی سہولت موجود ہے (چشمِ ماروشن دلِ ماشاد!) لیکن ان کے لیے وہاں کوئی خیر مقدم نہیں ہوگا۔ یعنی نہ تو کوئی ’’مرحبا‘‘ (خوش آمدید) کہنے والا ہوگا اور نہ ہی ’’مرحبا‘‘ کہنے کے لائق وہ ماحول ہوگا۔

﴿اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ﴿٥٩﴾﴾ ’’یہ ہیں آگ میں گھسنے آنے والے۔‘‘

آیت ۶۰ ﴿قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ ۟ لَا مَرْحَبًۢا بِكُمْ ؕ﴾ ’’وہ (نئے آنے والے) کہیں گے کہ نہیں بلکہ تم ایسے ہو! تمہارے لیے نہ ہو کوئی کشادگی!‘‘

تمہارے لیے کوئی ’’مرحبا‘‘ نہیں‘ کوئی خیر مقدم اور خوش آمدید نہیں!

﴿اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا ۚ فَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿٦٠﴾﴾ ’’تم نے ہی اسے ہمارے لیے پہلے بھیجا ہے‘ تو یہ بہت ہی بُری جگہ ہے ٹھہرنے کی۔‘‘

تم نے ہی ہمارے لیے یہ سارا سامان فراہم کیا ہے۔ یہ سارا تمہارا کیا دھرا ہے۔ تم ہماری پہلی نسل ہو اور تم نے ہی ہمیں گمراہ کیا تھا۔ تم لوگوں نے ہی ہمیں تمام غلط عقائد اور بُرے اعمال سکھائے تھے۔ تمہارے کرتوتوں کے باعث اور تمہاری پیروی کرنے کی وجہ سے ہی آج ہم یہاں جہنم میں آئے ہیں۔

آیت ۶۱ ﴿قَالُوْا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِی النَّارِ ﴿٦١﴾﴾ ’’وہ کہیں گے: پروردگار! جس نے یہ سب کچھ ہمارے لیے آگے بھیجا ہے تو اُس کے لیے عذاب کو آگ میں دوگنا بڑھا دے۔‘‘

جس نے ہمارے لیے یہ سارا سامان فراہم کیا ہے‘ جس نے ہمیں اس انجام کو پہنچانے کا بندوبست کیا ہے اُس کو دوزخ کا دوہرا عذاب دے!

آیت ۶۲ ﴿وَقَالُوْا مَا لَنَا لَا نَرٰی رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ ﴿٦٢﴾﴾ ’’اور وہ کہیں گے: کیا بات ہے ہم یہاں ان کو نہیں دیکھ رہے جنہیں ہم (دنیا میں) برے لوگوں میں شمار کرتے تھے؟‘‘

دنیا میں ہمارے ساتھ کچھ گھٹیا اور کم حیثیت لوگ بھی تو تھے جو محمد (ﷺ) پر ایمان لے آئے تھے۔ وہاں ہم انہیں تنگ کیا کرتے تھے اور ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ آج وہ لوگ یہاں جہنم میں نظر نہیں آرہے‘ معلوم نہیں کہاں چلے گئے ہیں!

آیت ۶۳ ﴿اَتَّخَذْنٰھُمْ سِخْرِیًّا﴾ ’’کیا ہم نے انہیں خواہ مخواہ ہنسی مذاق بنا لیا تھا‘‘

یعنی کیا ہم نے انہیں غلط سمجھا تھا؟ اور ہم ان کا جو مذاق اڑایا کرتے تھے کیا وہ سب بلاوجہ اور بے محل تھا؟ اور کیا اصل میں وہ برے لوگ نہیں تھے؟

﴿اَمْ زَاغَتْ عَنْھُمُ الْاَبْصَارُ ۝۶۳﴾ ’’یا ہماری نگاہیں ان سے چوک رہی ہیں؟‘‘

یعنی کیا وہ لوگ یہاں جہنم میں موجود ہی نہیں یا پھر ہم انہیں دیکھ نہیں پا رہے۔ اہلِ جہنم کی یہ ساری گفتگو اہلِ ایمان کے بارے میں ہوگی جو اس وقت جنت کی نعمتوں سے فیض یاب ہو رہے ہوں گے۔

آیت ۶۴ ﴿اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَھْلِ النَّارِ ۝۶۴﴾ ’’یقیناً یہ حق ہے اہلِ جہنم کے مابین جھگڑا!‘‘

تم لوگوں کو یقین رکھنا چاہیے کہ جیسے ہم یہ سب کچھ بیان کر رہے ہیں‘ اُس روز اہلِ جہنم کے مابین بالکل اسی طرح سے بحث و تکرار ہوگی۔

آیات ۶۵ تا ۸۸

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ۖ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝۶۵ رَبُّ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ۝۶۶ قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ۝۶۷ اَنْتُمْ عَنْهُ
مُعْرِضُوْنَ ۝۶۸ مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰٓى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۝۶۹ اِنْ يُّوْحٰٓى
اِلَيَّ اِلَّآ اَنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۷۰ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ
طِيْنٍ ۝۷۱ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝۷۲ فَسَجَدَ
الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝۷۳ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۷۴ قَالَ
يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ۭ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ
الْعَالِيْنَ ۝۷۵ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۭ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝۷۶ قَالَ
فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۝۷۷ وَّاِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ۝۷۸ قَالَ
رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝۷۹ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝۸۰ اِلٰى يَوْمِ
الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ۝۸۱ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۸۲ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ
الْمُخْلَصِيْنَ ۝۸۳ قَالَ فَالْحَقُّ ۡ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ ۝۸۴ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ

تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۸۵ قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ
الْمُتَكَلِّفِيْنَ ۝۸۶ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝۸۷ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ۝۸۸

آیت ۶۵ ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ۖ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝۶۵﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ میں تو بس ایک خبردار کرنے والا ہوں‘ اور نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے‘ وہ اکیلا ہے اور ہر چیز پر پوری طرح چھایا ہوا ہے۔‘‘

آیت ۶۶ ﴿رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ۝۶۶﴾ ’’وہ رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے مابین ہے‘ اور وہ بہت زبردست‘ بہت بخشنے والا ہے۔‘‘

آیت ۶۷ ﴿قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ۝۶۷﴾ ’’آپ کہہ دیجیے کہ یہ ایک بہت بڑی خبر ہے۔‘‘

آیت ۶۸ ﴿اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ ۝۶۸﴾ ’’تم اس سے اعراض کر رہے ہو۔‘‘

دیکھو! ہمارے یہ رسول (ﷺ) تمہارے پاس بہت بڑی اور فیصلہ کن بات لے کر آئے ہیں‘ لیکن تم لوگ ہو کہ مسلسل اس سے اعراض کیے جا رہے ہو۔

آیت ۶۹ ﴿مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰٓى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۝۶۹﴾ ’’مجھے کچھ علم نہیں ملأ اعلیٰ کے بارے میں‘ جب وہ باہم بحث و تکرار کر رہے ہوتے ہیں۔‘‘

یہ مضمون سورۃ الزمر کی آخری آیت میں بھی آئے گا۔ فرشتے چونکہ عاقل ہستیاں ہیں اس لیے تکوینی امور پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ اپنی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ مثلاً ممکن ہے کسی وقت کوئی فرشتہ کسی ملک یا قوم کے بارے میں کہتا ہو کہ اب تو ان لوگوں پر عذاب آ جانا چاہیے اور اس کے جواب میں کوئی دوسرا کہتا ہو کہ نہیں ابھی انہیں کچھ مزید مہلت ملنی چاہیے۔ آخری فیصلہ تو ہر کام میں اللہ تعالیٰ ہی کا ہوتا ہے‘ لیکن فرشتے بھی مختلف امور کے بارے میں باہم گفتگو کرتے ہیں اور اس طرح ان کی آراء میں کبھی کبھی اختلاف بھی ہو جاتا ہے۔

آیت ۷۰ ﴿اِنْ يُّوْحٰٓى اِلَيَّ اِلَّآ اَنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۷۰﴾ ’’میری طرف تو بس یہی وحی کی جاتی ہے کہ میں صرف واضح طور پر خبردار کر دینے والا ہوں۔‘‘

آیت ۷۱ ﴿اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ۝۷۱﴾ ’’جب کہا تھا آپؐ کے رب نے فرشتوں سے کہ میں بنانے والا ہوں ایک بشر کو مٹی سے۔‘‘

قصۂ آدم و ابلیس کے ذکر کے حوالے سے یہ قرآن کریم کا ساتواں اور آخری مقام ہے۔

آیت ۷۲ ﴿فَاِذَا سَوَّیۡتُہٗ﴾ ’’تو جب میں اس کو پوری طرح درست کر دوں‘‘

’’تسویہ‘‘ کے معنی کسی تخلیق کو ہر لحاظ سے درست کر کے اس کی تکمیل کر دینے کے ہیں۔ انگریزی میں اسے finishing touch دینا کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ’’تسویہ‘‘ کا مرحلہ بنیادی تخلیق کے بعد آتا ہے‘ جیسا کہ سورۃ الاعلیٰ میں فرمایا گیا: ﴿سَبِّحِ اسۡمَ رَبِّکَ الۡاَعۡلَی ﴿۱﴾ الَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی ﴿۲﴾﴾ ’’آپ تسبیح کیجیے اپنے رب کے نام کی‘ جس نے تخلیق کیا‘ پھر تسویہ کیا‘‘۔ سورۃ الاعلیٰ کے مطالعہ کے دوران اس موضوع پر ان شاء اللہ تفصیل سے گفتگو ہوگی۔

﴿وَنَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ فَقَعُوۡا لَہٗ سٰجِدِیۡنَ ﴿۷۲﴾﴾ ’’اور میں اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو تم گر پڑنا اس کے سامنے سجدے میں۔‘‘

یہاں پر رُوۡحِیۡ (میری روح) کا لفظ نوٹ کیجیے اور اس نکتے کو ذہن نشین کر لیجیے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا مسجودِ ملائک ہونا اس روحِ ربانی کی بنیاد پر تھا جو اللہ تعالیٰ نے اُن کے جسم میں پھونکی تھی۔ اس سے قبل نہ تو وہ مسجودِ ملائک تھے‘ اور نہ ہی ان کا وہ مقام و مرتبہ تھا جو بعد میں اشرف المخلوقات کی حیثیت سے ان کو ملا۔

آیت ۷۳ ﴿فَسَجَدَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ کُلُّہُمۡ اَجۡمَعُوۡنَ ﴿۷۳﴾﴾ ’’تو سجدہ کیا سب کے سب فرشتوں نے اکٹھے ہو کر۔‘‘

یہ بہت پُرزور اسلوب ہے۔ یہ آیت اس سے پہلے جوں کی توں سورۃ الحجر (آیت ۳۰) میں بھی آ چکی ہے۔

آیت ۷۴ ﴿اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ اِسۡتَکۡبَرَ وَ کَانَ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۷۴﴾﴾ ’’سوائے ابلیس کے‘ اُس نے تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے ہو گیا۔‘‘

اس کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ وہ کافروں میں سے تھا۔ کفر اور تکبر اس کے اندر پہلے سے موجود تھا جو اس موقع پر کھل کر سامنے آ گیا۔ جیسے غزوۂ احزاب کے موقع پر بہت سے منافقین کا نفاق واضح ہو کر ان کی زبانوں پر آ گیا تھا۔

آیت ۷۵ ﴿قَالَ یٰۤاِبۡلِیۡسُ مَا مَنَعَکَ اَنۡ تَسۡجُدَ لِمَا خَلَقۡتُ بِیَدَیَّ ؕ﴾ ’’اللہ نے فرمایا: اے ابلیس! تجھے کس چیز نے روکا کہ تو اُس کو سجدہ کرتا جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے؟‘‘

یہاں پر آدم علیہ السلام کی تخلیق کو اللہ تعالیٰ کا اپنے دونوں ہاتھوں سے نسبت دینا بہت اہم اور قابلِ غور ہے۔ قرآن کریم میں اللہ کی قدرت کے استعارے کے طور پر اللہ کے ہاتھوں کا ذکر متعدد بار آیا ہے۔ جیسے سورۂ یٰسٓ کی آیت ۷۱ میں فرمایا گیا کہ ہم نے اپنے ہاتھوں (اَیۡدِیۡنَا) سے ان کے لیے چوپائے بنائے ہیں‘ لیکن آیت زیر مطالعہ میں ’’دونوں ہاتھوں‘‘ کا ذکر خصوصی اہتمام کے ساتھ ہوا ہے۔ میرے نزدیک اس سے دو عالم یعنی عالمِ خلق اور عالمِ امر مراد ہیں‘ جنہیں اللہ تعالیٰ نے آدم یعنی انسان میں جمع کر دیا ہے۔ سورۃ الاعراف کی آیت ۵۴ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اَلَا لَہُ الۡخَلۡقُ وَ الۡاَمۡرُ ؕ﴾ یعنی خلق اور امر کے دونوں عالم اُسی کے ہیں‘ ان دونوں پر اسی کا تسلّط اور اسی کی حکومت ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی کچھ مخلوق تو ایسی ہے جس کا تعلق صرف عالمِ امر سے ہے۔ مثلاً فرشتے جو حیوانی جسم یا حیوانی خواہشات نہیں رکھتے اور نر یا مادہ کی تفریق سے بھی منزّہ و مبرّا ہیں۔ دوسری طرف جنّات اور تمام ارضی حیوانات ہیں جو عالمِ خلق کی مخلوق ہیں۔ ان میں ’’روح‘‘ نہیں پائی جاتی۔ اس لحاظ سے انسان گویا اللہ تعالیٰ کی واحد مخلوق ہے جس کا تعلق ان دونوں عالم سے ہے۔ اس کا حیوانی جسم مٹی سے بنا ہے‘ اس لحاظ سے یہ ’’عالمِ خلق‘‘ کی چیز ہے‘ جبکہ اس کے جسم میں پھونکی گئی روح ’’عالمِ امر‘‘ کی امانت ہے۔ جیسا کہ سورۃ الاحزاب کی اس آیت میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ الۡجِبَالِ فَاَبَیۡنَ اَنۡ یَّحۡمِلۡنَہَا وَ اَشۡفَقۡنَ مِنۡہَا وَ حَمَلَہَا الۡاِنۡسَانُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوۡمًا جَہُوۡلًا ﴿۷۲﴾﴾ ’’یقیناً ہم نے امانت کو پیش کیا آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر تو انہوں نے انکار کر دیا اس کو اٹھانے سے اور وہ اس سے ڈر گئے‘ اور انسان نے اسے اٹھا لیا۔ یقیناً وہ بڑا ظالم اور بڑا جاہل ہے‘‘۔ (امانت کے اس تصور کی وضاحت اس آیت کے مطالعے کے دوران کی جا چکی ہے۔)

چنانچہ تخلیقِ آدم کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھوں کا ذکر گویا استعارہ ہے اس کی تخلیق میں عالمِ خلق اور عالمِ امر کو جمع کرنے کا۔ انسان کو دونوں ہاتھوں سے بنانے کا یہ مفہوم بھی لیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو خصوصی اہتمام سے بنایا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے اشرف المخلوقات بنایا ہے اور اس لحاظ سے یہ اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق کا نقطہ عروج (climax) ہے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ بالکل صحیح ہے۔

﴿اَسۡتَکۡبَرۡتَ اَمۡ کُنۡتَ مِنَ الۡعَالِیۡنَ ﴿۷۵﴾﴾ ’’کیا تو نے تکبر کیا یا تو عالی مرتبہ لوگوں

میں سے ہے؟''

آیت ۷۶ ﴿قَالَ اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡهُ ؕ﴾ ''اُس نے کہا: میں اس سے بہتر ہوں!''

اُس نے کہا ہاں! یہ بات صحیح ہے کہ میں اس سے بہتر اور برتر ہوں۔ دراصل شیطان کا یہ دعویٰ اس کے مشاہدے کی بنیاد پر تھا۔ اس کے پیش نظر صرف حضرت آدمؑ کا جسدِ خاکی تھا۔ اس کے اندر پھونکی گئی روح کا اسے علم نہیں تھا۔ چنانچہ اس کا یہ دعویٰ کہ ''میں اس خاکی وجود سے بہتر ہوں'' اُس کے مشاہدے کے اعتبار سے کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔

﴿خَلَقۡتَنِیۡ مِنۡ نَّارٍ وَّ خَلَقۡتَهٗ مِنۡ طِیۡنٍ ﴿۷۶﴾﴾ ''مجھے بنایا تو نے آگ سے اور اس کو بنایا مٹی سے!''

آیت ۷۷ ﴿قَالَ فَاخۡرُجۡ مِنۡهَا فَاِنَّكَ رَجِیۡمٌ ﴿۷۷﴾﴾ ''اللہ نے فرمایا: نکل جاؤ یہاں سے! اب تم مردود ہو گئے ہو۔''

آیت ۷۸ ﴿وَّ اِنَّ عَلَیۡكَ لَعۡنَتِیۡۤ اِلٰی یَوۡمِ الدِّیۡنِ ﴿۷۸﴾﴾ ''اور اب تم پر میری لعنت رہے گی جزا اور سزا کے دن تک۔''

آیت ۷۹ ﴿قَالَ رَبِّ فَاَنۡظِرۡنِیۡۤ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ ﴿۷۹﴾﴾ ''اُس نے کہا: پروردگار! پھر مجھے مہلت دے' اُس دن تک جب یہ لوگ دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔''

آیت ۸۰ ﴿قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الۡمُنۡظَرِیۡنَ ﴿۸۰﴾﴾ ''اللہ نے فرمایا: ٹھیک ہے تمہیں یہ مہلت دے دی گئی۔''

اللہ تعالیٰ کے اس حکم میں بھی ''استحقار'' کا وہی انداز محسوس کیا جا سکتا ہے جو اوپر آیت ۷۷ میں پایا جاتا ہے۔

آیت ۸۱ ﴿اِلٰی یَوۡمِ الۡوَقۡتِ الۡمَعۡلُوۡمِ ﴿۸۱﴾﴾ ''اُس دن تک جس کا وقت طے شدہ ہے۔''

تمہارے کہنے کے مطابق تمہیں اُس دن تک مہلت دے دی گئی ہے جس دن آدمؑ اور اس کی پوری نسل کو دوبارہ اٹھایا جائے گا۔

آیت ۸۲ ﴿قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغۡوِیَنَّهُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۸۲﴾﴾ ''اُس نے کہا: پس تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو گمراہ کر کے رہوں گا۔''

آیت ۸۳ ﴿اِلَّا عِبَادَكَ مِنۡهُمُ الۡمُخۡلَصِیۡنَ ﴿۸۳﴾﴾ ''سوائے ان میں سے تیرے اُن

بندوں کے جنہیں تُو نے خالص کر لیا ہو۔''

آیت ۸۴ ﴿قَالَ فَالۡحَقُّ ۫ وَ الۡحَقَّ اَقُوۡلُ ﴿۸۴﴾﴾ ''اللہ نے فرمایا: تو حق یہ ہے' اور میں تو حق ہی کہتا ہوں۔''

آیت ۸۵ ﴿لَاَمۡلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنۡكَ وَ مِمَّنۡ تَبِعَكَ مِنۡهُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۸۵﴾﴾ ''کہ پھر میں بھی بھر کر رہوں گا جہنم کو تجھ سے اور ان سب سے جو تیری پیروی کریں گے۔''

آیت ۸۶ ﴿قُلۡ مَاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَیۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہیے کہ میں تم سے اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا''

یہ واقعہ سنا کر اب حضور ﷺ سے مخاطب ہو کر فرمایا جا رہا ہے کہ آپؐ انہیں جتلائیں کہ میں تم لوگوں کو یہ غیب کی خبریں سنا رہا ہوں' ازل میں رونما ہونے والے واقعات کی تفصیلات سے تمہیں آگاہ کر رہا ہوں' لیکن تم ذرا یہ بھی تو سوچو کہ میں نے اس سب کچھ کے عوض تم لوگوں سے کبھی کوئی اجر یا انعام تو طلب نہیں کیا۔

﴿وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُتَكَلِّفِیۡنَ ﴿۸۶﴾﴾ ''اور میں کوئی بناوٹ کرنے والوں میں سے بھی نہیں ہوں۔''

مُتَکَلِّف (تکلف کرنے والا) کا مفہوم سمجھنے کے لیے دو ایسے اشخاص کی مثال سامنے رکھیں جن میں سے ایک شاعر ہے اور دوسرا متشاعر۔ ایک شخص فطری طور پر شاعر ہے' شاعری اس کی طبیعت میں گندھی ہوئی ہے اور اس پر اشعار کی آمد ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرے شخص (متشاعر) کی طبیعت شعر کے لیے بالکل موزوں نہیں ہے۔ البتہ وہ محنت کرتا ہے' علم عروض کے امور سیکھنے کی کوشش کرتا ہے' ذخیرۂ الفاظ جمع کرتا ہے' قافیے جوڑتا ہے اور یوں تصنّع اور تکلّف سے شعر کہتا ہے۔ چنانچہ یہ شخص شاعری کے میدان میں گویا ''مُتَکَلِّف'' ہے۔ چنانچہ ان آیات میں حضور ﷺ کی زبانِ اطہر سے مشرکینِ مکّہ کے لیے کہلوایا جا رہا ہے کہ لوگو! کچھ تو عقل سے کام لو' تم لوگ مجھے بچپن سے جانتے ہو: ﴿فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِیۡكُمۡ عُمُرًا مِّنۡ قَبۡلِهٖ ؕ﴾ (یونس:۱۶) ''میں تمہارے درمیان ایک عمر گزار چکا ہوں اس سے پہلے بھی''۔ میرے عادات و اطوار اور میری طرزِ زندگی سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ تم خوب جانتے ہو کہ میں کوئی تکلف اور تصنّع پسند شخص نہیں ہوں۔ تم اس حقیقت سے بھی آگاہ ہو کہ میں

نے اب تک کی عمر میں کبھی کوئی شعر نہیں کہا' اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میں نے خطابت کا فن سیکھنے کے لیے کبھی کوئی مشقت یا ریاضت نہیں کی۔ تو تم لوگوں نے یہ کیسے سوچ لیا ہے کہ اب میں نے اچانک تکلّف اور تصنّع کا سہارا لے کر شاعری میں طبع آزمائی شروع کر دی ہے اور تم لوگوں کو وحی کے نام پر میں اپنا کلام سنا رہا ہوں؟

آیت ۸۷ ﴿اِنۡ ہُوَ اِلَّا ذِکۡرٌ لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۸۷﴾﴾ ''نہیں ہے یہ مگر ایک یاددہانی اور نصیحت تمام جہان والوں کے لیے۔''

آیت ۸۸ ﴿وَ لَتَعۡلَمُنَّ نَبَاَہٗ بَعۡدَ حِیۡنٍ ﴿۸۸﴾﴾ ''اور تم ضرور جان لو گے اس کی اصل خبر ایک وقت کے بعد۔''

ان لوگوں تک قرآن کا پیغام پہنچ چکا ہے' انہیں خاطر خواہ طور پر یاددہانی کرا دی گئی ہے' ہر لحاظ سے ان پر حجت قائم ہو چکی ہے۔ اب بہت جلد اس اتمامِ حجت کا نتیجہ ان کے سامنے آ جائے گا۔ سورۃ الطارق میں قرآن کے بارے میں یوں فرمایا گیا ہے: ﴿اِنَّہٗ لَقَوۡلٌ فَصۡلٌ ﴿۱۳﴾ وَّ مَا ہُوَ بِالۡہَزۡلِ ﴿۱۴﴾﴾ یعنی یہ قرآن کوئی بے مقصد کلام نہیں ہے' بلکہ یہ فیصلہ کن قول بن کر آیا ہے۔ اب اس کے ذریعے سے حق و باطل کے درمیان فیصلہ ہو جائے گا۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۰۵ میں قرآن کا تعارف اِن الفاظ میں کرایا گیا ہے: ﴿وَ بِالۡحَقِّ اَنۡزَلۡنٰہُ وَ بِالۡحَقِّ نَزَلَ ؕ﴾ کہ ہم نے اس قرآن کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور یہ حق کے ساتھ نازل ہوا ہے۔ اب اسی کے ترازو میں قوموں کی تقدیریں تلیں گی اور اسی کی عدالت میں ان کے عروج و زوال سے متعلق فیصلے ہوں گے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی روایت سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ((اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتَابِ اَقْوَامًا وَیَضَعُ بِہٖ آخَرِیْنَ))[1] ''اللہ تعالیٰ اسی کتاب کی بدولت بعض اقوام کو عروج پر پہنچائے گا اور اس کو ترک کرنے کی وجہ سے بعض کو قعرِ مذلّت میں گرا دے گا۔''

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا' باب فضل من یقوم بالقرآن......

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

توبہ کی تاثیر

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

گناہ میں مبتلا ہوجانا انسان کی فطری کمزوری ہے اور بڑے سے بڑا انسان بھی اس کمزوری سے بالاتر نہیں۔ اللہ تعالیٰ انسان کا خالق ہے اور وہ انسان کی اس کمزوری سے واقف ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہر انسان پر رحم کرے' لہٰذا اُس نے گناہوں کو بخشوانے کا طریقہ بھی بتا دیا ہے' بلکہ وہ اپنے اس بندے پر خوش ہوتا ہے اور بیش از بیش نوازشات کرتا ہے جو اپنے گناہوں کا احساس کر کے اُن کی بخشش کے لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے اور ان گناہوں کے ارتکاب پر شرمندہ ہوتا ہے اور آئندہ اُن سے علیحدہ رہنے کا پکا ارادہ کرتا ہے۔

گناہوں کو بخشوانے کے اس سہارے کا نام ''توبہ'' ہے۔ توبہ عربی زبان کا لفظ ہے اور قرآن و حدیث میں اس کا بکثرت ذکر موجود ہے۔ قرآن کی ایک سورت کا نام بھی ''التوبہ'' ہے۔ لفظ توبہ کی نسبت انسان کی طرف ہو تو اس کے ساتھ اِلٰی کا صلہ آتا ہے اور جب اس کی نسبت اللہ کی طرف ہو تو اس کے ساتھ عَلٰی کا صلہ آتا ہے۔ پہلی صورت میں اس کا معنی ہوتا ہے اپنے گناہوں پر نادم ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہونا اور اللہ تعالیٰ سے گناہوں کی معافی چاہنا۔ دوسری صورت میں اس کا معنی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی طرف رحمت کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے۔

بندے کا صحیح توبہ کرنا یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والے طریقے پر ندامت محسوس کرے' اس کو فوراً چھوڑ دے اور آئندہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرلے۔ گناہ کی زندگی یاد آئے تو اس پر افسوس کرے' نادم اور ناخوش ہو۔ چونکہ گناہ کرنا انسان کی فطری کمزوری ہے اس لیے سچی توبہ کرنے کے بعد بھی گناہ کے صدور کا امکان باقی رہتا ہے۔ ایسی صورت میں بندہ اپنی توبہ کی تجدید کرتا ہے اور اس گناہ کو پھر چھوڑ دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کی گرفت نہیں کرتا' بلکہ دوبارہ معاف کر دیتا ہے' بلکہ خلوصِ نیت کے ساتھ توبہ کرنے والے کی برائیوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں میں بدل دیتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ

حَسَنٰتٍ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝﴾ (الفرقان)

''مگر جس نے توبہ کی (اپنے گناہوں سے) اور ایمان لا کر عمل صالح کرنے لگا تو ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ تعالیٰ بھلائیوں سے بدل دے گا۔ اور اللہ تو ہے ہی بخشنے والا اور رحم کرنے والا۔''

توبہ کی تاثیر یہ ہے کہ سالہا سال تک گناہوں میں آلودہ رہنے والا بلکہ شرک اور کفر میں زندگی گزارنے والا بھی تائب ہو کر اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ دین اسلام کی طرف آجائے تو اللہ تعالیٰ اُس کی توبہ قبول کر لیتا ہے' اپنی رحمت کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے' اور اس کی گناہوں سے بھری ہوئی گزشتہ زندگی پر مواخذہ نہیں کرتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ)) (سنن ابن ماجہ)

''گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہو جاتا ہے جیسے اس نے سرے سے کوئی گناہ کیا ہی نہیں۔''

بخاری اور مسلم کی حدیث میں یہ الفاظ ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ ہر اُس شخص کی توبہ قبول فرماتا ہے جو اس کے حضور توبہ کرے''۔ اسی طرح ایک اور متفق علیہ روایت میں ہے کہ ''بندہ جب اپنے قصور کا اعتراف کر لیتا ہے اور توبہ کرتا ہے تو اللہ بھی (رحمت کے ساتھ) اس کی طرف رجوع فرماتا ہے۔''

گناہوں سے توبہ کر کے اگرچہ انسان اپنا ہی فائدہ کرتا ہے' مگر بندے کی یہ توبہ اللہ تعالیٰ کو بھی خوش کر دیتی ہے' کیونکہ وہ انسانوں کی طرف مائل بہ کرم ہے اور اُسے اپنے بندوں کو معاف کرنا اچھا لگتا ہے۔ ایک بیوقوف آدمی گناہ پر گناہ کیے جاتا ہے' وہ سالہا سال تک ایسا ہی کرتا رہتا ہے اور بزعم خویش یہ سمجھتا ہے کہ اُس کے یہ کام اللہ کو ناپسند ہوتے تو وہ اُسے ایسا کرنے سے روک دیتا یا سزا دیتا۔ مگر وہ بھول جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہوں پر اُس کی فوری گرفت نہیں کرتا بلکہ اُس پر رحمت کرتے ہوئے اُسے مہلت دیے جاتا ہے تاکہ وہ احساسِ گناہ کر کے واپس مڑ آئے اور توبہ کر کے اپنے گناہ بخشوا لے۔ یہ تو بندے کی انتہائی بدنصیبی ہے کہ وہ اپنی خطاؤں بھری زندگی سے تائب نہیں ہوتا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی مہلت کو نعمت سمجھتا ہے اور نہ اُس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ رات کے وقت اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ دن کے وقت گناہ کرنے والا توبہ کرلے' اور دن کے وقت اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ رات کے وقت گناہ کرنے والا توبہ کرلے (اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے) حتیٰ کہ سورج مغرب کی طرف سے طلوع ہو جائے'' (مسلم)۔ جب سورج مغرب کی طرف سے طلوع

ہو جائے گا تو اُس وقت توبہ کرنے کی مہلت ختم ہو جائے گی اور کسی کی توبہ قبول نہ کی جائے گی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ تَابَ قَبْلَ اَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ)) (صحیح مسلم)

’’جس شخص نے سورج کے مغرب کی طرف طلوع ہونے سے پہلے پہلے توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمالیتا ہے۔‘‘

کسی خطاکار بندے کی توبہ سے اللہ تعالیٰ اس قدر خوش ہوتا ہے جتنا وہ بندہ خوش ہوتا ہے جس کو موت نظر آ رہی ہو اور اچانک اُسے زندگی مل جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’اللہ اپنے بندے کی توبہ سے جب وہ اس کے حضور توبہ کرتا ہے اس شخص سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جس کی سواری کسی جنگل بیابان میں اس سے دور بھاگ گئی ہو' جب کہ اُس کے کھانے پینے کا سامان بھی اُس پر تھا۔ وہ اسے تلاش کرتے کرتے مایوس ہو گیا اور ایک درخت کے سائے تلے لیٹ گیا۔ اسی کرب میں تھا کہ اچانک دیکھتا ہے کہ سواری اس کے پاس کھڑی ہے۔ اس نے اس کی مہار تھامی پھر شدتِ فرحت سے کہنے لگا: ((اَللّٰهُمَّ اَنْتَ عَبْدِيْ وَاَنَا رَبُّكَ)) (صحیح مسلم) ’’اے اللہ! تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں‘‘۔ یعنی خوشی کی شدت کی وجہ سے وہ غلط کہہ بیٹھا‘‘ اور اُسے خیال ہی نہ رہا کہ وہ زبان سے کیا الفاظ کہہ رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو وہ بندے پسند ہیں جن سے خطا ہو جائے تو فوراً اُس کی معافی کے لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے اعترافِ خطا کریں' گڑگڑائیں اور توبہ کریں۔ گویا وہ بندے اللہ کے پسندیدہ ہیں جن سے خطائیں ہوتی ہیں' پھر وہ سچے دل سے توبہ کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّ بَنِيْ آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ)) (سنن الترمذی)

’’آدمؑ کی ساری اولاد خطا کار ہے اور بہتر خطا کار وہ ہیں جو توبہ کرنے والے ہیں۔‘‘

جو انسان سچے دل سے اپنے گناہ سے توبہ کرتا ہے اُس کا گناہ بخش دیا جاتا ہے' مگر طبعی کمزوری کی بنا پر وہ اپنی توبہ توڑ بیٹھتا ہے اور بارِ دگر اُس سے اُس کا ارتکاب ہو جاتا ہے۔ پھر وہ گناہ بخشوانے کے لیے دوبارہ سچی توبہ کا سہارا لیتا ہے اور برائی سے باز رہتا ہے' لیکن پھر اُس کی کمزوری آڑے آتی ہے اور اس کی توبہ ٹوٹ جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ’’جو شخص مغفرت طلب کرتا ہے اور وہ گناہ پر اصرار نہیں کرتا اگر وہ دن میں ستر مرتبہ وہی گناہ دہرائے تو وہ معاف کر دیا جاتا ہے۔‘‘ (ترمذی) ایسا بندہ ہر دفعہ پوری شرائط کے ساتھ سچی توبہ

کرتا ہے تو اُس کو معاف کر دیا جاتا ہے۔

ایک طویل روایت ہے' رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ’’بندہ گناہ کرتا ہے تو کہتا ہے: میرے پروردگار! میں گناہ کر بیٹھا ہوں تو اسے بخش دے۔ تو اس کا رب فرماتا ہے: کیا میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہ بخش بھی سکتا ہے اور اس گناہ پر مؤاخذہ بھی کر سکتا ہے۔ میں نے اپنے بندے کو بخش دیا۔ پھر جس قدر اللہ چاہتا ہے وہ شخص گناہ سے باز رہتا ہے' لیکن پھر وہ گناہ کر بیٹھتا ہے اور کہتا ہے: اے میرے رب میں گناہ کر بیٹھا ہوں اسے معاف فرما دے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: کیا میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہ بخش سکتا ہے اور اس پر مواخذہ بھی کر سکتا ہے؟ میں نے اپنے بندے کو بخش دیا۔ پھر جس قدر اللہ چاہتا ہے وہ شخص گناہ سے باز رہتا ہے' لیکن پھر گناہ کر بیٹھتا ہے تو کہتا ہے: اے میرے رب میں ایک اور گناہ کر بیٹھا ہوں مجھے معاف فرما دے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: کیا میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہے اور اس پر مواخذہ بھی کر سکتا ہے؟ میں نے اپنے بندے کو معاف کر دیا' وہ جو چاہے سو کرے۔‘‘ (متفق علیہ)

اس کا مطلب یہ نہیں کہ گناہ کرنے والا اس ارادے سے گناہ کرتا جائے کہ بخشش تو ہو جائے گی' بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس بندے کا یہ رویہ رہا کہ خطا کے فوراً بعد پرخلوص توبہ کرتا رہا تو اپنے اس رویے سے وہ اپنی خطائیں معاف کراتا رہے گا اور مؤاخذے سے بچا رہے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’اللہ تعالیٰ گناہ میں مبتلا بہت زیادہ توبہ کرنے والے مؤمن بندے کو پسند کرتا ہے۔‘‘ (مسند احمد) یہ وہی مؤمن بندہ ہے جو بشری تقاضے کے تحت بار بار گناہ کرتا ہے مگر ہر دفعہ سچے دل سے توبہ کرتا ہے اور اپنے رب کو راضی کر لیتا ہے۔ وہ فریبی بندہ اس میں شامل نہیں جو نفسانی خواہش کے تحت گناہ کرتا رہتا ہے اور اُس کی توبہ جھوٹی ہوتی ہے۔ نہ توبہ کی شرائط پوری کرتا ہے اور نہ اس کی توبہ پُرخلوص ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی بیکار ہے کہ انسان میری توبہ، میری توبہ کہتا رہے مگر اپنے عمل کی اصلاح پر توجہ نہ دے بلکہ گناہ کو بطور پیشہ اختیار کر لے۔

سچی اور گناہوں کو مٹا دینے والی توبہ وہ ہے کہ جب نادانی میں گناہ ہو جائے تو فوراً بخشن ہار کی طرف رجوع کرے اور گناہ سے باز رہنے کا عزم کرے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷﴾﴾ (النساء)

’’اللہ کے ذمّے ہے توبہ قبول کرنا ایسے لوگوں کی جو کوئی بُری حرکت کر بیٹھتے ہیں جہالت اور نادانی میں پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ تو یہی ہیں جن کی توبہ اللہ قبول فرمائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ باخبر ہے اور حکیم ودانا ہے۔‘‘

کچھ لوگ جھوٹی توبہ کرتے ہیں بایں طور کہ وہ زبان سے توبہ کا اقرار کرتے ہیں مگر عمل سے اپنی توبہ کو سچا ثابت نہیں کرتے۔ یوں وہ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں‘ لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ اللہ تو علیمٌ بذات الصدور ہے‘ وہ دھوکے میں نہیں آسکتا۔ جو لوگ گناہوں پر اصرار کرتے ہیں‘ اللہ کی دی ہوئی مہلت سے فائدہ نہیں اٹھاتے حتیٰ کہ ان کی موت کا وقت آ پہنچتا ہے تو اُس وقت وہ کہتے ہیں کہ اب میں توبہ کرتا ہوں تو ان لوگوں کی توبہ بے اثر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝۱۸﴾ (النساء)

’’اور ایسے لوگوں کا کوئی حق نہیں ہے توبہ کا جو بُرے کام کیے چلے جاتے ہیں‘ یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے تو اُس وقت وہ کہتا ہے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں اور نہ ان لوگوں کی توبہ ہے جو کفر کی حالت میں ہی مر جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے تو ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔‘‘

فرعون نے بھی توبہ اُس وقت کی تھی جب اس نے اپنی موت دیکھ لی‘ لہٰذا اُس کی توبہ قبول نہ ہوئی اور وہ راندۂ درگاہ ہی رہا۔

توبہ سے چونکہ گناہ نسیاً منسیا ہو جاتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو توبہ کی تلقین کرتا ہے تاکہ بندے اپنے گناہ بخشوالیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝۵۳﴾ (الزمر)

’’(اے نبی ﷺ) کہہ دیجیے کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ‘ یقیناً اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے‘ یقیناً وہ بخشنے والا مہربان ہے۔‘‘

سلسلہ وار دروسِ قرآن (۱۰)

وضاحتِ ایمان اور دعوتِ ایمان

شجاع الدین شیخ☆

آج ہم سورۃ التغابن کا مطالعہ کریں گے جس کا عنوان ''ایمان' اس کے ثمرات اور مضمرات'' ہے۔ اس سورہ کا پہلا رکوع دس آیات پر مشتمل ہے جن میں سات آیات وضاحتِ ایمان پر مبنی ہیں اور اگلی تین آیات میں دعوتِ ایمان دی گئی ہے۔ یہ قرآن کا بڑا پیارا مقام ہے جہاں ہمارے سامنے ایمان کی تفصیلات جامعیت کے ساتھ آئی ہیں۔ ان آیات کا بلحاظ تدبر مطالعہ سے پہلے ان کا اجمالی تجزیہ کرتے ہیں۔ پہلی چار آیات ایمان باللہ' دوسری دو آیات ایمان بالرسالت اور اس سے اگلی آیت ایمان بالآخرت سے متعلق ہے۔ آیت ۸ میں ایمان کی دعوت کا بیان ہے۔ آیت ۹ میں ایمان کی دعوت قبول کرنے والوں کے لیے انعاماتِ الٰہیہ اور آیت ۱۰ میں ایمان قبول نہ کرنے والوں کے انجامِ بد کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

تسبیح کا مفہوم اور قدرتِ الٰہیہ کی شان

اب ہم ایک ایک آیت پر غور وفکر کرتے ہیں۔ پہلی آیت کے ابتدا میں ارشاد ہوا: ﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ﴾ ''اللہ کی تسبیح کرتی ہے اور کرے گی ہر وہ شے جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ شے جو زمین میں ہے''۔ تسبیح کا لغوی معنی ہے: تیرنا یا کسی شے کو اس کے اصل مقام پر برقرار رکھنا اور اس کا اصطلاحی معنی ہے: پاکی بیان کرنا۔ تسبیح باری تعالیٰ سے مراد اس حقیقت کو بیان کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر کمی' ہر عیب' ہر نقص' ہر احتیاج اور ہر کمزوری سے پاک ہے۔ اللہ کو کوئی زوال نہیں آسکتا اور اس کو کوئی حاجت نہیں۔ اس کی قدرت میں کوئی کمی نہیں ہے۔ یہ کمزوریاں بندوں کے ساتھ وابستہ ہیں اور اللہ تعالیٰ ان تمام کمزوریوں سے

☆ معاون برائے مرکزی شعبہ تعلیم وتربیت' تنظیم اسلامی

پاک ہے۔

ہر جگہ اور ہر وقت اللہ کی تسبیح جاری ہے اور کائنات کی ہر شے زبانِ حال کے ساتھ ساتھ قولی تسبیح کر رہی ہے۔ ایک طرف کائنات کا ذرّہ ذرّہ ہمارے سامنے اللہ ربّ العزت کی قدرت کی نشانیاں پیش کر رہا ہے اور دوسری طرف ہر شے اپنی زبان سے بھی اللہ کی تسبیح کر رہی ہے' لیکن ہم سمجھ نہیں سکتے۔ یہی بات سورہ بنی اسرائیل میں آئی جہاں ارشاد ہوا: ﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ﴾ (آیت ۴۴) ''ساتوں آسمان' زمین اور جو مخلوقات ان میں ہیں سب اسی کی تسبیح کرتے ہیں اور (مخلوقات میں سے) کوئی چیز نہیں مگر اس کے شکر کے ساتھ تسبیح کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے''۔ اسی طرح ہر شے اپنے وجود سے بھی خالق کائنات کی گواہی دے رہی ہے اور یہ بھی تسبیح کی ایک صورت ہے۔

آیت زیر مطالعہ کے آخر میں ارشاد ہوا: ﴿لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ ۡ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ①﴾ ''اسی کی ہے بادشاہی اور اسی کے لیے ہے کل شکر اور وہ ہر چیز پر قادر ہے''۔ کائنات کا کل اختیار اللہ کے پاس ہے اور ہمارا معمولی اور عارضی اختیار بھی اسی کا عطا کردہ ہے۔ یہاں لفظ کُلّ ہمارے لیے پناہ گاہ ہے بایں طور کہ ہم اللہ کی ذات کا ادراک تو کر ہی نہیں سکتے' لیکن اس کی صفات کی بھی اصل کیفیت (quality) اور کمیت (quantity) ہمارے فہم سے بالاتر ہے۔ اسی لیے تو شاعر نے کہا ؎

تو دل میں تو آتا ہے' سمجھ میں نہیں آتا
بس جان گیا میں تری پہچان یہی ہے!

انسان کی تخلیق اور تقسیم

آیت ۲ میں ارشاد ہوا:

﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ②﴾

''وہی تو ہے جس نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر کوئی تم میں کافر ہے اور کوئی مؤمن۔ اور اللہ دیکھنے والا ہے جو کچھ تم کرتے ہو''۔

اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی دو طرح کی تقسیم یہاں بیان ہوئی ہے۔ دیکھئے' اللہ ربّ العزت ہی تمام مخلوقات کا واحد خالق و مالک ہے' لیکن کچھ مانتے ہیں اور کچھ نہیں۔ اب ماننے والے مؤمن اور نہ والے کافر ہیں' لیکن یہاں کافر سے مراد منافق ہے۔ منافق زبان سے اقرار کرتا ہے' لیکن دل سے نہیں مانتا۔ یعنی اللہ کو مانتا ہے' لیکن اللہ کی نہیں مانتا اور یہ عملاً انکار کا رویہ ہوتا ہے۔ سورۃ التغابن مدنی سورت ہے اور مدنی سورتوں میں جب ایمان والوں سے خطاب ہوتا ہے تو ان میں سچے مؤمن اور جھوٹے منافق دونوں شامل ہوتے ہیں۔ پھر یہ کہ طرزِ عمل مختلف ہو تو نتائج بھی مختلف نکلتے ہیں' چنانچہ ﴿وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝۲﴾ ''اور اللہ دیکھنے والا ہے جو کچھ تم کرتے ہو'' کے الفاظ ماننے والوں کے لیے دلجوئی اور ہمت افزائی کا باعث ہیں اور نہ ماننے والوں کے لیے تنبیہہ کا اظہار ہیں۔

تیسری آیت میں ارشاد ہوا:

﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَکُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَکُمْ ۚ وَاِلَیْہِ الْمَصِیْرُ ۝۳﴾

''اسی نے آسمانوں اور زمین کو بامقصد پیدا کیا اور اسی نے تمہاری صورتیں بنائیں اور تمہاری کیا ہی عمدہ صورتیں بنائیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

یہاں انسان کی تخلیق کے ساتھ آخرت کی طرف بھی اشارہ ہے۔ توحید انسان کو آخرت کی طرف لے جاتی ہے۔ انسان غور و فکر کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی معرفت بھی حاصل کر سکتا ہے اور آخرت کا احساس بھی اس میں پیدا ہوتا ہے۔ کائنات کی ہر تخلیق بامقصد ہے تو اشرف المخلوقات انسان کو بھی بے مقصد پیدا نہیں کیا گیا اور ربّ العالمین نے بندوں کو زمین پر اپنی عبادت کے لیے بھیجا ہے۔ اسی طرح قرآن ایک اور انداز سے فرماتا ہے: ﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا وَّاَنَّکُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۝۱۱۵﴾ (المؤمنون) ''کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بے فائدہ پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے''۔ اس میں یہ بھی باور کرا دیا گیا کہ جس پروردگار نے انسان کو پہلی بار پیدا فرمایا وہ اسے دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم

چوتھی آیت میں ارشاد ہوا:

﴿یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَیَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۭ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۴﴾

''وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو اور اللہ واقف ہے ان رازوں سے جو سینوں میں ہیں۔''

اللہ ربّ العزت کی صفتِ علم کے تین گوشے ہیں' بایں طور کہ اللہ ہر شے کا' شعوری نیت اور ارادے کا اور تحت الشعور کا علم رکھنے والا ہے۔ اس آیت میں فرمایا گیا کہ اللہ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے' گویا ہر شے کا علم اللہ کے پاس ہے۔ اس کے بعد فرمایا گیا کہ وہ جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو۔ ظاہر میں ہمارے اعمال اور چھپانے میں ہماری نیتیں اور ارادے آ گئے۔ آگے فرمایا گیا کہ اللہ ان رازوں سے بھی واقف ہے جو سینوں میں ہیں' یعنی اللہ ہمارے تحت الشعور کو بھی جانتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر میں لفظ شام کہوں تو ہمارے سامنے ملک شام کا وہ سارا منظرنامہ آ جائے گا جو وہاں آج کل ہو رہا ہے۔ اس لفظ کے آگے پورا پس منظر جو ہمارے سامنے آیا' یہ ہمارے تحت الشعور میں تھا۔ جو بات تحت الشعور میں تھی وہ شعوری سطح پر آ گئی۔ اسی طرح بہت ساری باتیں جو ہمارے تحت الشعور میں ہیں' اللہ ان کو بھی جانتا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی صفت علم کا جامع انداز میں تذکرہ آیا ہے۔

اللہ تعالیٰ جو کچھ جانتا ہے اس کا حساب آخرت میں ہو گا —— اللہ تعالیٰ ہمارے حساب کو آسان فرمائے —— ان باتوں کا بیان قرآن میں مختلف مقامات پر آیا ہے' مثلاً سورۃ البقرہ میں فرمایا:

﴿لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ ۭ فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَاۗءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝۲۸۴﴾

''جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے۔ اور تم اپنے دلوں کی بات کو ظاہر کرو یا چھپاؤ' اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔ پھر وہ جسے چاہے گا بخش دے گا اور جسے چاہے گا عذاب دے گا اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

ایمان بالآخرت کے حوالے سے شیطان یہ مغالطہ پیدا کرتا ہے کہ کیسے ممکن ہے کہ ہر انسان کا ہر عمل محفوظ کیا جا رہا ہو۔ اللہ کی صفت علم کا اس طور سے بیان دراصل اسی مغالطے کا ازالہ ہے۔

اقوامِ سابقہ پر عذاب ہمارے لیے باعثِ عبرت

پانچویں آیت میں فرمایا گیا:

﴿اَلَمۡ یَاۡتِکُمۡ نَبَؤُا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ قَبۡلُ ۫ فَذَاقُوۡا وَبَالَ اَمۡرِہِمۡ وَلَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۵﴾﴾

’’کیا نہیں آ گئی تم تک خبر ان لوگوں کی جنہوں نے تم سے پہلے کفر کیا تو انہوں نے اپنے کیے کا مزا چکھ لیا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔‘‘

انبیاء و مرسلین علیہم السلام کے واقعات قرآن حکیم میں دو اسلوب سے بیان ہوئے ہیں۔ پہلا اسلوب ’’قصص النبیین‘‘ کا ہے یعنی انبیاء کرام کے ذاتی حالات اور محاسن کا بیان جیسے سورۂ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ دوسرا اسلوب جو قرآن کریم نے بہت زیادہ استعمال کیا وہ ’’انباء الرسل‘‘ ہے یعنی رسولوں کا اپنی قوموں کے ساتھ کشمکش کا بیان۔ اس آیت میں انباء الرسل کا ذکر ہے جن کی تفاصیل سورۃ الاعراف‘ سورۂ ہود اور سورۃ الشعراء میں بیان ہوئی ہیں۔ آیت زیر مطالعہ میں کفر کرنے والوں سے قومِ نوحؑ‘ قومِ ہودؑ‘ قومِ صالحؑ‘ قومِ لوطؑ‘ قومِ شعیبؑ اور آلِ فرعون مراد ہیں۔ پہلی تین اقوام حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قبل اور بقیہ تین اقوام حضرت ابراہیمؑ کے بعد گزری ہیں۔ یہ خاص فرق اس لیے کیا جا رہا ہے کہ اس میں ایک نکتہ سمجھنے کا یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قبل تین اقوام میں اکثر معاملہ شرک کا تھا اور ان کے بعد تین اقوام میں دیگر برائیاں بھی پیدا ہوئیں۔ معیشت کی سطح پر ناپ تول میں کمی حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم میں‘ معاشرت کی سطح پر ہم جنس پرستی کی برائی حضرت لوط علیہ السلام کی قوم میں اور سیاسی سطح پر جبریہ غلام بنانے کی حرکت فرعون نے بنی اسرائیل کے ساتھ کی تھی۔

وَبَال سے مراد وہ عذاب ہیں جو قوموں پر دنیا میں آئے اور دنیا میں عذاب کا دیا جانا بعد والوں کے لیے عبرت کا سامان بھی ہوا کرتا ہے۔ ان عذابوں کی تفصیل سورۃ العنکبوت میں آئی ہے۔ وہاں فرمایا گیا:

﴿فَکُلًّا اَخَذۡنَا بِذَنۡۢبِہٖ ۚ فَمِنۡہُمۡ مَّنۡ اَرۡسَلۡنَا عَلَیۡہِ حَاصِبًا ۚ وَمِنۡہُمۡ مَّنۡ

اَخَذَتۡہُ الصَّیۡحَۃُ ۚ وَمِنۡہُمۡ مَّنۡ خَسَفۡنَا بِہِ الۡاَرۡضَ ۚ وَمِنۡہُمۡ مَّنۡ اَغۡرَقۡنَا ۚ وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیَظۡلِمَہُمۡ وَلٰکِنۡ کَانُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ ﴿۴۰﴾﴾

’’تو ہم نے سب کو ان کے گناہوں کے سبب پکڑ لیا‘ ان میں سے کچھ تو ایسے تھے جن پر ہم نے پتھروں کی بارش برسائی اور کچھ ایسے تھے جن کو چنگھاڑ نے آپکڑا اور کچھ ایسے تھے جنہیں ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور کچھ ایسے تھے جن کو ہم نے غرق کر دیا اور اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا لیکن وہی اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے۔‘‘

عَذَابٌ اَلِیۡمٌ سے آخرت کی سزا مراد ہے‘ گویا جو اللہ دنیا میں عذاب دیتا ہے وہ آخرت میں بھی عذاب دینے پر قادر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دنیا و آخرت کے عذاب سے محفوظ رکھے۔

رسالت اور بشریت: لازم وملزوم

چھٹی آیت میں فرمایا گیا:

﴿ذٰلِکَ بِاَنَّہٗ کَانَتۡ تَّاۡتِیۡہِمۡ رُسُلُہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ فَقَالُوۡۤا اَبَشَرٌ یَّہۡدُوۡنَنَا ۫ فَکَفَرُوۡا وَتَوَلَّوۡا وَّاسۡتَغۡنَی اللّٰہُ ؕ وَاللّٰہُ غَنِیٌّ حَمِیۡدٌ ﴿۶﴾﴾

’’یہ اس لیے ہوا کہ ان کے رسول واضح نشانیاں لے کر آئے تو انہوں نے کہا کہ کیا انسان ہمیں ہدایت دیں گے؟ پھر انہوں نے انکار کیا اور منہ پھیر لیا اور اللہ بھی بے نیاز ہوا اور اللہ کسی کا محتاج نہیں اور بذاتِ خود محمود ہے۔‘‘

ایک قدیم گمراہی رسالت اور بشریت کا مجتمع ہونا ہے۔ ماضی میں یہ گمراہی رہی کہ لوگوں نے رسولوں کو ماننے سے اس لیے انکار کیا کہ ہماری طرح کا انسان رسول کیسے ہو سکتا ہے اور بعض نے جس کو رسول مانا‘ اسے انسان ماننے سے انکار کر دیا اور اس کو معاذ اللہ خدا کا درجہ دے دیا۔ اس قدیم گمراہی کے دو پہلو ہیں۔ پہلا پہلو بشر مان کر رسالت کا انکار ہے‘ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا: ﴿وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡۤا اِذۡ جَآءَہُمُ الۡہُدٰۤی اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اَبَعَثَ اللّٰہُ بَشَرًا رَّسُوۡلًا ﴿۹۴﴾﴾ ’’اور جب لوگوں کے پاس ہدایت آ گئی تو ان پر ایمان لانے سے اس کے سوا کوئی چیز مانع نہ ہوئی کہ کہنے لگے کہ کیا اللہ نے ایک آدمی کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟‘‘ دوسرا پہلو یہ ہے کہ رسول مان کر بشریت کا انکار کیا گیا۔ یہ حرکت یہود و نصاریٰ نے بھی کی مثلاً سورۃ التوبہ میں فرمایا گیا: ﴿وَقَالَتِ الۡیَہُوۡدُ عُزَیۡرُ ۨابۡنُ اللّٰہِ وَقَالَتِ النَّصٰرَی الۡمَسِیۡحُ ابۡنُ

اللّٰہِ ؕ﴾ (آیت ۳۰) ’’اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں‘‘۔ گویا انہوں نے رسول تو مانا مگر بشر ماننے سے انکار کر دیا۔ خدا کا بیٹا قرار دینا دراصل خدا قرار دینا ہے‘ کیونکہ انسان کا بیٹا انسان ہوتا ہے تو خدا کا بیٹا نعوذ باللہ خدا ہی ہو گا۔ انسان ماننا اور رسول نہ ماننا اور رسول ماننا لیکن انسان نہ ماننا دونوں گمراہی کی باتیں ہیں۔ یہ دراصل رسول کی اطاعت اور اس کی اتباع سے فرار ہے۔ اللہ نے بندوں کو بندگی کے لیے پیدا کیا‘ لیکن بندہ یہ پسند نہیں کرتا۔ یہ گمراہیاں ماضی میں رہی ہیں اور آج بھی اس کے کچھ رخ ہمیں دکھائی دیتے ہیں۔ ہمیں یہ جائزہ لینا چاہیے کہ رسول ﷺ کی اطاعت ہم پر کیسی گزرتی ہے اور ہمیں رسول اللہ ﷺ کے اتباع کا کتنا ذوق و شوق ہے۔

رسالت کے بارے میں قرآن حکیم کی رہنمائی کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تمام رسول انسان تھے لیکن اللہ کے چنے ہوئے خاص بندے تھے۔ سورۃ الکہف میں ارشاد ہوا: ﴿قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ یُوۡحٰۤی اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰـہُکُمۡ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ۚ﴾ (آیت ۱۱۰) ’’(اے نبی ﷺ!) فرما دیجیے کہ میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں (البتہ) میری طرف وحی آتی ہے کہ تمہارا (معبود) بس وہی ایک معبود ہے‘‘۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں سے رسولوں کو چنا تا کہ وہ انسانوں کے لیے نمونہ بنیں اور وہ اللہ کے چنے ہوئے خاص بندے تھے جن پر وحی آتی تھی۔ گویا عام انسان اور پیغمبر میں بہت بڑا فرق ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا: ﴿قُلۡ لَّوۡ کَانَ فِی الۡاَرۡضِ مَلٰٓئِکَۃٌ یَّمۡشُوۡنَ مُطۡمَئِنِّیۡنَ لَنَزَّلۡنَا عَلَیۡہِمۡ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَکًا رَّسُوۡلًا ﴿۹۵﴾﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) فرما دیجیے کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے (کہ اس میں) چلتے پھرتے (اور) آرام کرتے (یعنی بستے) تو ہم ان کے پاس فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتے‘‘۔ اللہ کو کسی کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ کوئی اسے مان لے تو اس کی بادشاہی میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اور کوئی انکار کر دے تو اس کی جلالتِ شان میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اطاعت کرو گے تو تمہارا ہی فائدہ ہو گا اور انکار کرو گے تو تمہارا ہی نقصان ہو گا۔

ایمان بالآخرت اور دعوتِ ایمان

آیت ۷ میں فرمایا گیا:

﴿زَعَمَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنۡ لَّنۡ یُّبۡعَثُوۡا ؕ قُلۡ بَلٰی وَرَبِّیۡ لَتُبۡعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا

عَمِلۡتُمۡ ؕ وَذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرٌ ﴿۷﴾﴾

’’خوش فہمی ہے ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا کہ وہ دوبارہ زندہ نہیں کیے جائیں گے۔ کہہ دیجیے کیوں نہیں‘ میرے رب کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے اور تمہیں ضرور بتا دیا جائے گا جو کچھ تم نے کیا اور یہ اللہ کے لیے آسان ہے۔‘‘

اس آیت میں آخرت کے عقیدے کا بیان آ رہا ہے۔ بَلٰی وَرَبِّیۡ کے الفاظ دراصل وقوعِ قیامت کے لیے دلیل خطابی کا درجہ رکھتے ہیں۔ بعض اوقات ہم عقلی دلائل پیش کرتے ہیں اور بعض اوقات خطاب کرنے والے کی شخصیت اتنی اعتماد والی ہوتی ہے کہ اس کی بات کو مانا جاتا ہے۔ یہاں قرآن حکیم نے وقوعِ قیامت کے لیے عقلی دلائل پیش نہیں کیے‘ بلکہ رسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکات کو پیش کیا ہے جو قسم کھا کر بیان کر رہے ہیں کہ تمہیں دوبارہ زندگی عطا ہو گی۔ اس دلیل کو دلیل خطابی کہتے ہیں۔ قسم کے پس منظر میں دلیل آپ ﷺ کی مثالی سیرت و کردار ہے۔ جس ذات نے بندوں کے معاملات میں کبھی جھوٹ نہیں بولا تو وہ اللہ کے بارے میں کیسے جھوٹ بول سکتی ہے۔ علاوہ ازیں ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرٌ یہ وقوعِ قیامت پر دوسری دلیل ہے‘ یعنی جس ذات نے تمہیں پہلی بار پیدا فرمایا اس کا تمہیں دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے۔

لفظ قُلۡ پر عمل کا مظہر آپ ﷺ کا ایک پُرحکمت خطبہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ الرَّائِدَ لَا یَکۡذِبُ اَھۡلَہٗ، وَاللّٰہِ لَوۡ کَذَبۡتُ النَّاسَ جَمِیۡعًا مَا کَذَبۡتُکُمۡ، وَلَوۡ غَرَرۡتُ النَّاسَ جَمِیۡعًا مَا غَرَرۡتُکُمۡ، وَاللّٰہِ الَّذِیۡ لَا اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ اِنِّیۡ لَرَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ خَاصَّۃً وَاِلَی النَّاسِ کَافَّۃً، وَاللّٰہِ لَتَمُوۡتُنَّ کَمَا تَنَامُوۡنَ، ثُمَّ لَتُبۡعَثُنَّ کَمَا تَسۡتَیۡقِظُوۡنَ، ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ، ثُمَّ لَتُجۡزَوُنَّ بِالۡاِحۡسَانِ اِحۡسَانًا وَبِالسُّوۡءِ سُوۡءًا، وَاِنَّھَا لَجَنَّۃٌ اَبَدًا اَوۡ لَنَارٌ اَبَدًا)) (۱)

’’بیشک قافلے کا رہبر قافلے والوں سے جھوٹ نہیں بولتا۔ اللہ کی قسم! اگر (بالفرض) میں تمام انسانوں سے جھوٹ بولتا تب بھی تم سے کبھی جھوٹ نہیں بولتا اور اگر تمام انسانوں کو فریب دیتا تب بھی تمہیں کبھی فریب نہ دیتا۔ قسم ہے اللہ کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں‘ بیشک میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری طرف خصوصاً اور پوری نوعِ انسانی کی طرف

(۱) بحواله جمهرة الخطب‘ ص ۵۔ وفقه السيرة للالبانی‘ ص ۹۷۔

عموماً۔ اللہ کی قسم! تم سب یقیناً مرجاؤ گے جیسے (روزانہ) سو جاتے ہو۔ پھر یقیناً اٹھائے جاؤ گے جیسے (ہر صبح) بیدار ہو جاتے ہو۔ پھر لازماً تم سے حساب لیا جائے گا ہر اس عمل کا جو تم کرتے رہے ہو اور لازماً تمہیں بدلہ دیا جائے گا اچھائی کا اچھا بدلہ اور برائی کا برا بدلہ اور وہ جنت ہے ہمیشہ ہمیش کی اور آگ ہے ہمیشہ ہمیش کی۔"

یہ آخرت کے اعتبار سے نبی اکرم ﷺ کا پُرحکمت خطبہ ہے۔

آیت ۸ میں ارشاد ہوا:

﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۸﴾

"تو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول ﷺ پر اور اس نور (قرآن) پر جو ہم نے نازل فرمایا اور اللہ باخبر ہے اس عمل سے جو تم کرتے ہو۔"

یہاں ایمان قبول کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ فَاٰمِنُوْا سے مراد یہ ہے کہ اب تک جو مضامین بیان ہوئے ہیں وہ تو حق ہیں ہی' لہٰذا تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ ان پر ایمان لے آؤ۔ الحمدللہ ہم ایمان تو رکھتے ہیں' البتہ اللہ تعالیٰ ہمیں یقین قلبی والا ایمان عطا فرمائے۔

اللہ کی صفتِ خبیر اس اسلوب پر آنے والی دیگر صفات یعنی سمیع' بشیر اور شہید وغیرہ سے زیادہ جامع ہے۔ بقیہ صفات سے بھی علم حاصل ہوتا ہے' اس لیے کہ اللہ کی تمام صفات ہی کامل ہیں' مگر خبیر جامع صفت ہے جس میں سننے' دیکھنے کے علاوہ اور پہلو بھی شامل ہیں۔ دیگر صفات وہ ذرائع ہیں جن سے حاصل ہونے والی معلومات پر غور و تجزیہ سے صفت خبیر نتائج اخذ کرتی ہے۔

جیتنے اور ہارنے والوں کا بیان

آیت ۹ میں ارشاد ہوا:

﴿يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۹﴾

"جس دن وہ تم کو جمع کرے گا یعنی جمع کرنے کے دن' وہ ہوگا ہار اور جیت کا دن' اور جو شخص ایمان لایا اللہ پر اور اس نے نیک عمل کیے' اللہ اس سے اس کی برائیاں دور کر دے گا اور اسے داخل کرے گا ان باغات میں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔

رہیں گے ان میں ہمیشہ ہمیش' یہی شاندار کامیابی ہے۔"

اللہ انہی کامیاب ہونے والوں میں ہم سب کو شامل فرمائے ـــــ یہاں تغابن کا لفظ آیا ہے اور سورت کا نام بھی تغابن ہے۔ اس لفظ کے لغوی معنی ہے: کسی کا کسی کو نقصان پہنچانا' اسی سے لفظ غبن نکلا ہے جو اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اصطلاحی معنی ہار اور جیت ہے۔ "یوم التّغابن" کے الفاظ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ دنیا کی زندگی محض کھیل اور تماشا یعنی ڈرامہ ہے اور ہار اور جیت کا اصل دن آخرت کا دن ہے۔ ڈراموں میں مختلف لوگوں کو مختلف کردار دیے جاتے ہیں اور جب ڈرامہ ختم ہوتا ہے تو کسی کا کوئی کردار نہیں رہتا۔ اسی کو قرآن مختلف انداز سے سکھاتا ہے' مثلاً سورۃ العنکبوت میں ارشاد ہوا: ﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِىَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۶۴﴾ "اور یہ دنیا کی زندگی تو محض کھیل اور تماشا ہے اور (ہمیشہ کی) زندگی (کا مقام) تو آخرت کا گھر ہے۔ کاش یہ لوگ سمجھتے"۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

آیت ۱۰ میں فرمایا گیا:

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۱۰﴾

"اور جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا وہی ہیں اہلِ جہنم' ہمیشہ اس میں رہیں گے اور وہ بُری جگہ ہے۔"

اللہ ہم سب کی اس سے حفاظت فرمائے ـــــ اصل ہار اس کی ہے جس نے کفر کیا اور اللہ کی آیات کی تکذیب کی۔ کفر کے معنی اندر کی موجود حقیقت کو چھپانا یعنی باطن میں جس حق کی معرفت حاصل ہو چکی ہے' اس کا اظہار نہ کرنا۔ ابوجہل کا دل مان چکا تھا' لیکن تکبّر آڑے آتا تھا۔ ایسے ہی آل فرعون کے ہاں ہوا۔ سورۃ النمل میں ارشاد ہوا: ﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ۭ﴾ (آیت ۱۴) "اور انہوں نے بے انصافی اور غرور سے ان (اللہ کی آیات) کا انکار کیا جبکہ وہ دلی طور پر ان پر یقین کر چکے تھے"۔ تکذیب کے معنی دعوتِ حق سامنے آنے پر اسے جھٹلانا ہے۔ پیغمبروں کی دعوت کو رد کرنا تکذیب کہلاتا ہے اور ایسے لوگوں کا انجام خلود فی النار ہے۔ اے اللہ! ہمیں جہنم کی آگ سے بچا۔ آمین! ۞ ۞ ۞

فہمِ قرآن —— ایک تشنہ پہلو

ڈاکٹر محمد سرشار خان

فضیلت آدمؑ کی بنیاد

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝٣١ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝٣٢﴾ (البقرة)

”پھر آدم کو (اللہ نے) سارے نام سکھا دیے‘ پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور (ان سے) کہا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ وہ بول اُٹھے آپ ہی کی ذات پاک ہے‘ جو کچھ علم آپ نے ہمیں دیا ہے اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے‘ حقیقت میں علم وحکمت کے مالک تو صرف آپ ہیں۔“

خالقِ کون ومکاں نے تمام مخلوقات کو اس تقریب میں آنے کا حکم دیا اور فرشتوں سے کہا کہ اگر وہ اپنے دعویٰ میں سچے ہیں تو اس کی پیدا کردہ اشیاء کے نام (خواص) بتائیں۔ انسانی دماغ دراصل ناموں کے ذریعے ہی اشیاء کا علم اپنے ذہن میں محفوظ کرتا ہے۔ مثلاً جب وہ موبائل فون کا نام لیتا ہے تو اس کے متعلق بہت زیادہ علم ہوتا ہے کہ یہ کیسے کام کرتا ہے اور کیا کیا کام کرتا ہے۔ انسان کی تمام معلومات دراصل اسمائے اشیاء پر مشتمل ہیں اور حضرت آدم علیہ السلام کو سارے نام سکھانا گویا ان کو تمام اشیاء کا علم دینا تھا۔ چنانچہ آدمؑ نے ودیعت شدہ علم کی بنا پر انہیں ٹھیک ٹھیک بیان کر دیا۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جنت میں اپنے ہاتھوں سے خصوصی طور پر تخلیق کیا اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک کر اسے اپنی صفاتِ عالیہ کا مظہر بنا دیا اور اس علیم وخبیر نے انسان پر اپنی

تخلیقات کے بے شمار راز آشکار کر دیے۔ یوں آدمؑ اپنے خصوصی وصف یعنی علم الاشیاء اور اپنے اندر موجود روحِ ربانی کی بنیاد پر مسجودِ ملائک ٹھہرے۔ فرشتوں کو سجدہ کا حکم دینا اصل میں احاطہ کائنات میں متعین تمام مخلوقات کو بشمول فرشتوں کے انسان کے لیے مسخر کر دینا ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ﴾ (الجاثية:١٣)

”اور اس نے مسخر کر دیا تمہارے لیے اپنی طرف سے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے سب کچھ۔“

یعنی کائنات کی ہر چیز کا مقصد انسان کی خدمت ہے۔ اگر کوئی انسان اس سے اپنی اور بنی نوعِ انسان کی خدمت کا کام نہ لے تو وہ خلیفۃ الارض کہلانے کا ہرگز دعویدار نہیں ہو سکتا۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے تخلیقِ آدم کے بعد زمین میں اسے اپنے نائب کا عہدہ عطا فرمایا تو ساتھ ہی اولادِ آدم سے اس عہدے کا حلف بھی لیا۔ پوچھا: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ﴾ (الاعراف:١٧٢) ”کیا میں تمہارا رب نہیں؟“ انہوں نے عرض کی: ﴿بَلٰى ۚ شَهِدْنَا ۚ﴾ ”کیوں نہیں‘ ہم اس پر گواہ ہیں“ —— یہ عہد ہر روحِ انسانی اللہ تعالیٰ سے کر کے دنیا میں آئی ہے اور اُخروی مواخذے کی اصل بنیاد یہی گواہی فراہم کرتی ہے —— تب اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے فرمایا: ”ایسا نہ ہو کہ تم قیامت کے دن کہو کہ ہم تو اس (عہد) سے غافل تھے......“ اللہ تعالیٰ نے مزید فرمایا کہ میں تمہارے پاس اپنے پیغام بر بھیجوں گا جو تم کو یہ عہد و میثاق جو تم میرے ساتھ باندھ رہے ہو‘ یاد دلائیں گے تاکہ تمہیں وہ حلفِ وفاداری یاد رہے جو تم نے روزِ ازل اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ساتھ کیا تھا۔

اسی طرح اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اسمائے اشیاء یعنی اپنی تخلیقات کا جو علم وشعور عطا فرمایا تھا اس کی یاددہانی اور تحصیل کے لیے انبیاء کرام علیہم السلام پر اپنی کتب اور خصوصاً اپنی آخری کتاب جو هُدًى لِّلنَّاسِ اور هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ہے بھیجی‘ تاکہ انسان کے خلیفۃ الارض ہونے کی تکمیل ہو سکے۔

علم الاشیاء

علم الاشیاء کیا ہے؟ خالقِ کائنات کی بنائی ہوئی اشیاء کی ہیئت وساخت اور افعال وخواص

کے بارے میں مشاہدات اور تجربات کے ذریعے حاصل ہونے والے علم کو ''علم الاشیاء'' کہتے ہیں۔ سائنس اسی علم کا نام ہے' یعنی اشیاء پر غور وفکر کہ وہ کیسی ہیں اور کن اصولوں اور قوانین کے تحت کام کرتی ہیں؟

کائنات میں غور وفکر

آیئے دیکھیں کہ قرآن مجید ہمیں کس کس طرح سے کائنات میں غور وفکر کا حکم دیتا ہے۔ چند آیات ملاحظہ فرمائیں:

○ ﴿اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِہِمۡ وَ یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ ہٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾﴾ (آل عمران)

''آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور دن رات کے بدلنے میں ان عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں' جو کھڑے' بیٹھے اور کروٹ کے بل لیٹے اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمان وزمین کی پیدائش پر غور وفکر کرتے رہتے ہیں۔ (اور کہتے ہیں:) اے ہمارے رب! تُو نے یہ عبث پیدا نہیں فرمایا۔ تُو پاک ہے' بس ہمیں دوزخ سے بچا۔''

○ ﴿اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ وَ الۡفُلۡکِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِہِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا وَ بَثَّ فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّۃٍ ۪ وَّ تَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾﴾ (البقرۃ)

''بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے میں اور کشتیوں (اور جہازوں) میں جو دریا (اور سمندر) میں لوگوں کے فائدے کی چیزیں لے کر رواں ہیں اور بارش میں جس کو اللہ آسمان سے برساتا اور اس سے زمین کو مرنے کے بعد زندہ (یعنی خشک ہوئے پیچھے سرسبز) کر دیتا ہے اور زمین پر ہر قسم کے جانور پھیلانے میں اور ہواؤں کے چلانے میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں عقلمندوں کے لیے (اللہ کی قدرت کی) نشانیاں ہیں۔''

○ ﴿وَ مِنۡ اٰیٰتِہٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافُ اَلۡسِنَتِکُمۡ وَ اَلۡوَانِکُمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلۡعٰلِمِیۡنَ ﴿۲۲﴾﴾ (الروم)

''اور اسی کے نشانات (اور تصرفات) میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا جدا جدا ہونا۔ اہلِ دانش کے لیے ان (باتوں) میں (بہت سی) نشانیاں ہیں۔''

○ ﴿وَ مِنۡ اٰیٰتِہٖۤ اَنۡ یُّرۡسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّ لِیُذِیۡقَکُمۡ مِّنۡ رَّحۡمَتِہٖ وَ لِتَجۡرِیَ الۡفُلۡکُ بِاَمۡرِہٖ وَ لِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِہٖ وَ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۴۶﴾﴾ (الروم)

''اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ خوشخبریاں لانے والی ہوائیں بھیجتا ہے' اور یہ اس لیے کہ تمہیں اپنی رحمت کا کچھ مزہ چکھائے' اور اس کے حکم سے کشتیاں (یا جہاز) چل سکیں اور اس لیے کہ تم اس کا کچھ فضل تلاش کرو اور اس لیے کہ شاید تم شکر ادا کرو۔''

○ ﴿وَ مَا یَسۡتَوِی الۡبَحۡرٰنِ ٭ۖ ہٰذَا عَذۡبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُہٗ وَ ہٰذَا مِلۡحٌ اُجَاجٌ ؕ وَ مِنۡ کُلٍّ تَاۡکُلُوۡنَ لَحۡمًا طَرِیًّا وَّ تَسۡتَخۡرِجُوۡنَ حِلۡیَۃً تَلۡبَسُوۡنَہَا ۚ وَ تَرَی الۡفُلۡکَ فِیۡہِ مَوَاخِرَ لِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِہٖ وَ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۱۲﴾ یُوۡلِجُ الَّیۡلَ فِی النَّہَارِ وَ یُوۡلِجُ النَّہَارَ فِی الَّیۡلِ ۙ وَ سَخَّرَ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ ۫ۖ کُلٌّ یَّجۡرِیۡ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمۡ لَہُ الۡمُلۡکُ ؕ وَ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖ مَا یَمۡلِکُوۡنَ مِنۡ قِطۡمِیۡرٍ ﴿۱۳﴾﴾ (فاطر)

''اور دو دریا یکساں نہیں ہیں' یہ میٹھا ہے اور اس کا پینا پیاس بجھاتا ہے اور یہ کھارا اور سخت کڑوا ہے۔ اور تم دونوں سے تروتازہ گوشت کھاتے ہو اور پہننے کے لیے زینت کا سامان نکالتے ہو۔ اور اسی پانی میں تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں اس کا سینہ چیرتے چلی جارہی ہیں تاکہ تم اللہ کا کچھ فضل تلاش کرو اور اس کے شکر گزار بنو۔ وہ رات کو دن کے اندر داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور سورج اور چاند کو اس نے مسخر کر رکھا ہے۔ یہ سب کچھ ایک وقت مقررہ تک چلتے جارہا ہے۔ (جس کے یہ سارے کام ہیں) یہ تمہارا رب ہے' اسی کی بادشاہی ہے۔ اور تم جن کو اس کے سوا پکارتے ہو وہ تو کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں۔''

○ ﴿اَوَلَمۡ یَرَوۡا اِلَی الۡاَرۡضِ کَمۡ اَنۡۢبَتۡنَا فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ زَوۡجٍ کَرِیۡمٍ ﴿۷﴾﴾ (الشعراء)
''کیا انہوں نے زمین کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اس میں ہر قسم کی کتنی نفیس چیزیں اُگائی ہیں؟''

○ ﴿اَوَلَمۡ یَرَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ کَانَتَا رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰہُمَا ؕ وَ جَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ کُلَّ شَیۡءٍ حَیٍّ ؕ اَفَلَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳۰﴾ وَ جَعَلۡنَا فِی الۡاَرۡضِ رَوَاسِیَ اَنۡ تَمِیۡدَ بِہِمۡ ۪ وَ جَعَلۡنَا فِیۡہَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّہُمۡ یَہۡتَدُوۡنَ ﴿۳۱﴾ وَ جَعَلۡنَا السَّمَآءَ سَقۡفًا مَّحۡفُوۡظًا ۚۖ وَّ ہُمۡ عَنۡ اٰیٰتِہَا مُعۡرِضُوۡنَ ﴿۳۲﴾ وَ ہُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ الَّیۡلَ وَ النَّہَارَ وَ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ ؕ کُلٌّ فِیۡ فَلَکٍ یَّسۡبَحُوۡنَ ﴿۳۳﴾﴾ (الانبیاء)
''کیا کافروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین دونوں ملے ہوئے تھے تو ہم نے ان کو جدا جدا کر دیا؟ اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں۔ تو کیا یہ لوگ ایمان نہیں لاتے؟ اور ہم نے زمین میں پہاڑ بنائے تاکہ لوگوں (کے بوجھ) سے ہلنے (اور جھکنے) نہ لگے اور اس میں کشادہ راستے بنائے تاکہ لوگ ان پر چلیں۔ اور آسمان کو محفوظ چھت بنایا' اور اس پر بھی وہ ہماری نشانیوں سے منہ پھیر رہے ہیں۔ اور وہی تو ہے جس نے رات اور دن اور سورج اور چاند کو بنایا۔ یہ سب (یعنی سورج اور چاند اور ستارے) آسمان میں (اس طرح چلتے ہیں گویا) تیر رہے ہیں۔''

○ ﴿اَفَلَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَی الۡاِبِلِ کَیۡفَ خُلِقَتۡ ﴿۱۷﴾ وَ اِلَی السَّمَآءِ کَیۡفَ رُفِعَتۡ ﴿۱۸﴾ وَ اِلَی الۡجِبَالِ کَیۡفَ نُصِبَتۡ ﴿۱۹﴾ وَ اِلَی الۡاَرۡضِ کَیۡفَ سُطِحَتۡ ﴿۲۰﴾ فَذَکِّرۡ ۟ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُذَکِّرٌ ﴿۲۱﴾﴾ (الغاشیۃ)
''بھلا وہ اونٹوں کی طرف نظر نہیں کرتے کہ وہ کیسے پیدا کیے گئے ہیں؟ اور آسمان کی طرف کہ وہ کیسے بلند کیا گیا ہے؟ اور پہاڑوں کی طرف کہ وہ کیسے نصب کیے گئے ہیں؟ اور زمین کی طرف کہ وہ کیسے بچھائی گئی ہے؟ پس (اے نبی ﷺ!) آپ نصیحت کیجیے کیونکہ آپ تو صرف نصیحت کرنے والے ہیں۔''

○ ﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ وَ لَوۡ کَانَ مِنۡ عِنۡدِ غَیۡرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوۡا فِیۡہِ اخۡتِلَافًا کَثِیۡرًا ﴿۸۲﴾﴾ (النساء)
''تو کیا یہ لوگ قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے؟ اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بکثرت اختلاف پاتے۔''

قرآن حکیم میں غور وفکر پر بہت زور دیا گیا ہے۔ قرآن حکیم میں ۱۳ آیات میں اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ (پس کیا تم عقل نہیں رکھتے؟) کے الفاظ آئے ہیں۔ ۸ آیات میں لَعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ (شاید کہ تم عقل کرو) کے الفاظ ہیں۔ ۸ آیات میں لِقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ (یہ باتیں عقل مند لوگوں کے لیے ہیں)۔ اسی طرح فکر کرنے کا حکم ۱۸ آیات میں ہے۔ اس کے علاوہ تدبّر اور دیکھنے یعنی غور وفکر کا ذکر بہت سی جگہوں پر ہے۔

قرآن حکیم میں عبادات وغیرہ کے بارے میں ۱۵۰ کے قریب آیات ہیں جبکہ کم از کم ۷۵۶ آیات میں خالقِ کائنات نے ہمیں اپنی تخلیقات میں غور وفکر کا حکم دیا ہے۔ اس غور وفکر کا کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے' اس پر بات کرتے ہیں:

○ ﴿الَّذِیۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ ہَلۡ تَرٰی مِنۡ فُطُوۡرٍ ﴿۳﴾ ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ کَرَّتَیۡنِ یَنۡقَلِبۡ اِلَیۡکَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا وَّ ہُوَ حَسِیۡرٌ ﴿۴﴾ وَ لَقَدۡ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡیَا بِمَصَابِیۡحَ وَ جَعَلۡنٰہَا رُجُوۡمًا لِّلشَّیٰطِیۡنِ وَ اَعۡتَدۡنَا لَہُمۡ عَذَابَ السَّعِیۡرِ ﴿۵﴾﴾ (الملک)
''(اللہ ہی وہ ذات ہے) جس نے سات آسمان تہ در تہ بنائے۔ (تو اے دیکھنے والے!) رحمٰن کے پیدا کرنے میں تو کوئی بے ضابطگی نہ دیکھے گا۔ ذرا نظر کو پھرا' کیا تو کوئی دراڑ دیکھتا ہے؟ پھر نظر کو دوبارہ پھرا' تیری طرف نظر واپس لوٹ آئے گی' عاجز اور تھکی ہوئی۔ اور ہم نے قریب کے آسمان کو (تاروں کے) چراغوں سے زینت دی اور ان کو شیاطین کے مارنے کا آلہ بنایا اور ہم نے ان کے لیے دہکتی آگ کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

○ ﴿الَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی ﴿۲﴾﴾ (الاعلیٰ)
''جس نے کائنات کی ہر چیز کو پیدا کیا پھر اسے (جملہ تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ) درست توازن دیا۔''

یعنی زمین سے آسمانوں تک کائنات کی ہر چیز کو پیدا کیا اور جو چیز بھی پیدا کی اسے بالکل راست اور درست بنایا۔ اس کا توازن اور تناسب ٹھیک ٹھیک قائم کیا' اس کو ایسی صورت پر پیدا کیا کہ اس جیسی چیز کے لیے اس سے بہتر صورت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہی بات ہے جو سورۃ السجدۃ میں یوں بیان فرمائی گئی ہے: ﴿الَّذِیۡۤ اَحۡسَنَ کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقَہٗ﴾ (آیت ۷) ''جس

نے نہایت خوب بنائی جو چیز بھی بنائی۔‘‘

اسی طرح دنیا کی تمام اشیاء کا موزوں اور متناسب پیدا ہونا‘ خود اس امر کی صریح علامت ہے کہ کوئی صانع حکیم ان سب کا خالق ہے۔ کسی اتفاقی حادثے یا ایک سے زیادہ خالقوں کے عمل سے کائنات کے ان بے شمار اجزاء واشیاء کی تخلیق میں یہ سلسلہ اور مجموعی طور پر ان سب اجزاء کے بے ہنگم اجتماع سے کائنات میں یہ ترتیب‘ نظم وضبط اور حسن وجمال پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

○ ﴿وَالَّذِیۡ قَدَّرَ فَہَدٰی ۳﴾ (الاعلیٰ)

’’اور جس نے (ہر ہر چیز کے لیے) قانون مقرر کیا پھر (اسے اپنے قانون اور نظام کے مطابق چلنے کا) راستہ بتایا۔‘‘

کسی شے کی مجال ہے کہ خالقِ کائنات کے بنائے ہوئے قوانین سے سرمو بھی انحراف کر سکے؟ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تخلیق کائنات کسی پیشگی منصوبہ بندی کے بغیر الل ٹپ نہیں ہوگئی تھی بلکہ اس کے لیے ایک پورا plan/lay out خالق کائنات کے پیش نظر تھا اور یہ سب کچھ اسی منصوبے کے تحت ہو رہا ہے۔ جب یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے تو انسان بے اختیار پکار اُٹھتا ہے کہ ’’اے رب! تُو نے یہ عبث پیدا نہیں کیا‘ تُو پاک ہے‘ پس ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔‘‘

آیاتِ الٰہی

قابلِ غور بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ کائنات کے مظاہر کو بھی ’’آیات‘‘ قرار دیا ہے اور قرآن حکیم کی طرح صحیفۂ کائنات کی ان آیات میں غور وفکر اور تدبر کا بھی حکم زور دے کر بار بار ہمیں دیا گیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو براہِ راست دیکھنا انسان کے بس میں نہیں‘ لیکن اس کی مخلوقات پر غور وفکر اس کو پہچاننے کا یقینی ذریعہ ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ پر ایمانِ کامل اور یقین واثق لانا ہو تو قرآن حکیم کی طرف رجوع کرو اور اس کے احکامات کے مطابق صحیفۂ کائنات پر پھیلی آیات (نشانیوں) پر غور وفکر کرو‘ کیونکہ انہیں نشانیاں کہا ہی اس لیے گیا ہے کہ ان کے ذریعے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی پہچان ممکن ہے۔ اس کی ربوبیت کی پہچان اور ادراک ہو جائے تو دل بے اختیار جذباتِ تشکر وامتنان سے مغلوب ہو کر سجدہ ریز ہو جاتا ہے کہ ’’اے ربّ! تُو نے یہ عبث پیدا نہیں فرمایا‘ تُو پاک ہے‘ پس ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔‘‘

اسلام کے نزدیک پوری کائنات ایک ہمہ گیر منصوبہ بندی کے تحت وجود میں لائی گئی اور

اس کے ذرّہ ذرّہ میں اہلِ بصیرت کے لیے اس کے خالق کے وجود‘ اس کی وحدت و یکتائی‘ قدرت‘ ربوبیت‘ صناعی‘ حکمت ومصلحت کے ناقابلِ انکار دلائل اور آیات یعنی نشانیاں موجود ہیں۔ سورۃ الاعراف میں فرمایا: ﴿اَوَلَمۡ یَنۡظُرُوۡا فِیۡ مَلَکُوۡتِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنۡ شَیۡءٍ ......﴾ (آیت ۱۸۵) ’’کیا ان لوگوں نے آسمان وزمین کی بادشاہی اور اللہ کی پیدا کی ہوئی کسی چیز پر نظر نہیں کی......؟‘‘

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا!

ہمارے پیارے نبی ﷺ کو بھی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے کتابِ فطرت کے مطالعے کا بھرپور موقع دیا۔ آپ ﷺ نے ابتدائی زندگی میں سنت پیغمبری کے تحت بکریاں بھی چرائیں کہ یہ بھی تربیت رسل کا ایک ذریعہ تھا۔ عرب کے لق ودق صحرا میں جہاں دور دور تک کوئی اور شخص دکھائی نہ دیتا ہو‘ اور آسمان‘ چارسو پھیلی وسیع زمین‘ جھاڑیاں اور درخت‘ پہاڑ‘ اڑتے پرندے‘ بادل‘ ہوا‘ گویا فطرت کے قریب ترین ہونے کے سامان۔ اوائل عمری کے بعد ایسی ہی کیفیت آپ ﷺ کو چالیس سال کی عمر میں نصیب ہوتی ہے جب آپؐ کو خلوت گزینی محبوب ہوگئی اور آپؐ مکہ سے باہر اکیلے ہی کتنے کتنے دن غارِ حرا میں عبادتِ الٰہی میں گزار دیتے تھے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کیسی عبادت کرتے تھے؟ نہ تو آپؐ کسی سابقہ مذہب کے پیروکار تھے‘ نہ کسی نبی کے پیروکار تھے اور نہ ہی آپ کی اُس وقت تک حضرت جبرائیل علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تھی کہ وہ آپؐ کو کوئی طریقۂ عبادت سکھا دیتے۔ اس کا جواب شارحین نے یہ دیا ہے کہ آپ ﷺ کی عبادت غور وفکر‘ سوچ وبچار‘ کتابِ فطرت کے مطالعے اور خود اپنی ذات میں غور وفکر پر مشتمل تھی۔

اسی غور وفکر کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر حقیقتوں کے دروازے کھول دیے:

﴿وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَہَدٰی ۷﴾ (الضحیٰ)

’’اور اللہ نے پایا آپؐ کو (حقیقت کی تلاش میں) سرگرداں تو آپؐ پر براہِ راست ہدایت منکشف فرما دی۔‘‘

حضور اکرم ﷺ کی دعا منقول ہے کہ ’’اے اللہ! مجھے حقیقتِ اشیاء کا علم دے‘‘۔ اگر

دیکھا جائے تو ایک عالم یا سائنسدان اس جامع ترین دعا سے بہتر کسی چیز کی خواہش نہیں کر سکتا۔ کیونکہ سائنس ہے ہی اشیاء کی حقیقت کو جاننے کا علم۔ پھر یہ دعا رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ''یارب میرے علم میں اضافہ فرما!'' علم کی فضیلت کی شاہد ہے۔ حضرت ابو ہریرہ ؓ سے مروی یہ حدیث نبویؐ ملاحظہ فرمائیں:

((اَلْكَلِمَةُ الْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ ، فَحَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا))

(رواه الترمذی و ابن ماجه)

''حکیمانہ بات مؤمن کی گمشدہ میراث ہے' پس وہ اس کا سب سے زیادہ حق دار ہے جہاں کہیں بھی اسے پائے۔''

انسان کی فطری جستجو اور تجسس کا بنیادی مقصد علم کے اسی خزانے کی تلاش ہے جو روزِ اوّل سے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اسے ودیعت فرمایا تھا اور جس کی بنیاد پر اسے اشرف المخلوقات کا رتبہ بخشا تھا۔

مسلمانوں کی بہت بڑی بدقسمتی یہ ہوئی کہ ایک غیر قرآنی رویے کے تحت علوم کو تقسیم کر دیا گیا۔ مثلاً اگر کوئی عالم دین آپ سے کہے کہ یہ تو دنیاوی کام ہے' آؤ! کچھ اللہ' اس کے رسول ﷺ اور آخرت کے لیے بھی کریں' اور اگر ایک شخص علم فلکیات یا طبیعیات کا مطالعہ کر رہا ہے تو اسے کہیں کہ یہ تو دنیاوی کام ہے' اسے چھوڑو' آؤ چلتے ہیں کچھ تبلیغ وغیرہ ہو جائے' تو آپ بتائیں اس رویے کی زد قرآن کی اس آیت پر کس طرح پڑے گی جس میں اُولُوالالباب (عقل مند) ان بندوں کو قرار دیا گیا جو اللہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں کھڑے' بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے اور آسمان اور زمین کی پیدائش میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ (آل عمران:۱۹۱)

علم کوئی بھی ہو وہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ آج اگر اہلِ یورپ علم و تحقیق اور جستجو میں آگے نکل گئے ہیں تو یہ اللہ کی مرضی کے بغیر نہیں ہے اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ان کو جستجوئے علم کا ثمر بھی بخشا ہے۔ دیکھئے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے سورۃ الانبیاء کی اس آیت میں مخاطب ہی کافروں کو کیا ہے: ﴿اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ﴾ (آیت ۳۰) ''تو کیا کافروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین آپس میں منہ بند تھے (یعنی اکٹھے جڑے تھے) پھر ہم نے ان دونوں کو جدا کر دیا''۔ اب یورپی سائنسدانوں نے یعنی کافروں نے معلوم کر لیا ہے کہ یہ کائنات ہمیشہ ایسی نہ تھی' بلکہ اچانک ایک بہت بڑے (Big Bang)

دھماکے کے نتیجے میں وجود میں آئی۔

مسلمانوں نے بہت عرصہ سے اپنے رسول ﷺ کا یہ فرمان بھلا دیا ہے:

((طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ)) (رواه ابن ماجه والطبرانی والبیهقی)

''علم حاصل کرنا ہر مسلمان (مرد و عورت) پر فرض ہے۔''

اور جنہوں نے اسے درخورِ اعتنا سمجھا بھی تو اس سے صرف دین کا علم مراد لیا' حالانکہ اگر دین کے علم کی قرآن و حدیث کی روشنی میں تشریح کی جائے تو تمام سائنسی علوم بھی اس میں آ جاتے ہیں۔ (بشرطیکہ ان کا مطالعہ اللہ عزوجل کو خالق کائنات مان کر کیا جائے۔) دراصل ہم جذباتی باتوں میں پڑ گئے' شاعری میں دلچسپی لینے لگے' اُلٹا ہم نے سائنسز کے خلاف ایک حصار قائم کر لیا اور آرٹس کے مضامین کو ترجیح دینے لگے۔ ہم میں ایسے لوگ نہ رہے جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے آرزو کرتے کہ ہمیں بھی اپنے اس علم اور حکمت سے کچھ عطا کر۔ یاد رکھیں کہ سائنس تمام تر حکمت ہے اور خداوند کریم فرماتے ہیں: ﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ﴾ (البقرۃ:۲۶۹) ''اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے' اور جسے حکمت عطا کی گئی اسے تو خیر کثیر عطا کر دیا گیا۔''

یہ سمجھنے کی بات ہے کہ سائنس اللہ کی حریف نہیں ہے' بلکہ وہ تو خود منکرینِ خدا سے اقرار کروا رہی ہے کہ کوئی تو ہے جو نظامِ ہستی چلا رہا ہے' وہی خدا ہے۔ اور ایک مسلمان کے نزدیک تو سائنس کا اعلیٰ ترین مقصدِ عبودیت اور تشکرِ الٰہی ہے۔ کائنات میں غور و فکر کر کے حاصل شدہ معلومات سے فائدہ اُٹھانا' عوام کی فلاح و بہبود کے لیے ایجادات و مصنوعات تیار کر کے ترقی و خوشحالی بڑھانا' یہ عین اسلامی طرزِ فکر ہے اور اس کام سے غفلت برتنا احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے' جیسے کوئی عام آدمی بادشاہ کے دیے گئے کسی بیش قیمت تحفے کو ٹھکرا دے یا نظر انداز کر دے تو یہ جان کر بادشاہ کا برہم ہونا فطری امر ہے۔ اسی طرح اس کائنات میں بکھری ہوئی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی اَن گنت نعمتوں سے اعراض کرنا' حق تعالیٰ کی ناراضی اور خفگی کا موجب ہے اور پرلے درجے کی ناشکری ہے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ قوانینِ فطرت کو سمجھ کر انہیں بنی نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لیے بروئے کار لایا جائے۔ اسی کا نام ٹیکنالوجی ہے۔ مثلاً لباس کے

بارے میں سورۃ الاعراف میں ذکر ہے:

﴿یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَرِیْشًا ؕ وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِکَ خَیْرٌ ؕ ذٰلِکَ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ لَعَلَّہُمْ یَذَّکَّرُوْنَ ﴿۲۶﴾﴾

’’اے بنی آدم! ہم نے تمہارے لیے لباس نازل کیا ہے جو تمہارے جسم کے قابلِ سَتر حصوں کو چھپاتا ہے اور خوشنمائی کا ذریعہ بھی ہے۔ اور تقویٰ کا لباس سب سے بہتر ہے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے تاکہ وہ نصیحت قبول کریں۔‘‘

لباس کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنی نشانیوں میں سے قرار دیا ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ لباس تو انسان خود تیار کرتا ہے۔ کپڑا اپنی بنائی شکل میں کسی درخت پر تو نہیں لگتا اور نہ کسی کان سے نکلتا ہے۔ اسی طرح کشتی کے بارے میں فرمایا: ﴿وَجَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الْفُلْکِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْکَبُوْنَ ﴿۱۲﴾﴾ (الزخرف) ’’اور تمہارے لیے کشتی اور چوپائے بنائے جن پر تم سواری کرتے ہو‘‘۔ اب کشتی تو انسان نے خود بنائی ہے‘ آسمان یا زمین سے بنی بنائی شکل میں تو نازل نہیں ہوئی۔ دراصل کشتی اور لباس کا ذکر بطورِ علامت ہوا ہے‘ جو سائنسی اصولوں یعنی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین کا مطالعہ کر کے انسان نے خود بنائے ہیں جو کہ عین منشائے الٰہی تھا۔ اسی طرح بے شمار ایجادات ومصنوعات کی صورت میں انسان کو میسر نعمتیں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہی کی دین ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ ظَاہِرَۃً وَّبَاطِنَۃً ؕ﴾ (لقمٰن: ۲۰)

’’کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے جو کچھ بھی آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے اور اللہ نے اپنی کھلی اور چھپی ہوئی نعمتیں تم پر مکمل کر دی ہیں۔‘‘

ہمیں ان سب کھلی اور چھپی ہوئی نعمتوں کا علم حاصل کر کے ان سے فائدہ اُٹھانا ہے۔ کفرانِ نعمت سے بچنے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت و ربوبیت کے اعتراف کا یہی بہترین طریقہ ہے۔

قرآن اور سائنس

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ سائنس مظاہر قدرت کے مطالعے اور اس کے افعال و قوانین کو سمجھنے کی وہ کوشش ہے جس کی فطری خواہش اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے روزِ ازل سے انسان

کے اندر رکھ دی ہے۔ انسان اپنے شعوری ارتقاء کے ساتھ ساتھ کائنات کے متعلق نظریات و خیالات کو بھی بہتر طور پر حقیقت کے قریب لا رہا ہے۔

مسئلہ تب پیدا ہوا جب یہودی‘ نصرانی اور دوسرے مذاہب کی تعلیمات نے سائنسی تحقیقات کی تائید نہیں کی بلکہ بعض صورتوں میں متضاد آراء قائم کیں‘ جس کی وجہ سے یورپ میں دو تین سو سال تک جہالت کا راج رہا اور کلیسا کی عمل داری کی بنا پر جدید سائنسی نظریات اور خیالات پر جمود طاری رہا۔ جب وہاں مذہب کو سائنس سے الگ کر کے مذہب کو انسان کا ذاتی معاملہ بنا دیا گیا تو نئے خیالات و نظریات کی راہیں کھل گئیں۔ بے شک یہودی و نصرانی مذاہب کی تعلیمات جدید سائنسی تحقیقات کی تائید نہیں کرتیں‘ لیکن دین فطرت ماننے والوں یعنی مسلمانوں کا قوانینِ فطرت کو دین سے متصادم سمجھنا عجیب سی بات لگتی ہے‘ کیونکہ یہ دین تو نہ صرف خود کائنات کے اسرار سے پردہ اُٹھاتا ہے بلکہ تخلیق کائنات کے مظاہر‘ جنہیں وہ آیات کہتا ہے‘ ان میں غور وفکر اور تدبر پر زور دیتا ہے۔ اس کا تو فلسفہ ہی یہ ہے کہ اس کائنات کو انسان کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے۔ اب یہ انسان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس میں غور وفکر اور تحقیق وجستجو کر کے اسے اپنے کام میں لائے اور اشرف المخلوقات ہونے کا حق ادا کرے۔

جب چودہ سو سال پہلے دنیا میں دین حق کا آغاز ہوا تو اس وقت یورپ جہالت کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ قوم کہ جس میں پڑھے لکھے لوگ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے‘ قرآنِ حکیم کے نورِ ہدایت سے فیض یاب ہو کر چند صدیوں میں علم وفکر سمیت ہر شعبے میں دنیا کی امام بن گئی۔

یہ مسلّمہ امر ہے کہ جدید سائنسی تحقیق کی ابتدا مسلمانوں نے کی‘ جب کہ یورپ زمانہ جاہلیت سے گزر رہا تھا۔ مسلمانوں کی سائنسی تحقیق کی پشت پر کائنات کا خالق تھا۔ مسلمان سائنس دانوں کی تحریروں اور مقالوں میں قرآنِ حکیم کے حوالے ملتے ہیں۔ بدقسمتی سے بعد ازاں مسلمانوں کی توجہ کائناتی فکر سے ہٹ کر دینی مسائل تک محدود ہو گئی۔ یوں سائنسی تحقیق یورپی محققین کے ہاتھوں میں چلی گئی‘ جنہوں نے دورِ اسلام کی تحقیق سے استفادہ کر کے اسے بہت آگے بڑھایا۔ لیکن ان کے ساتھ بھی مسئلہ یہی ہے کہ وہ اس کائنات کو تخلیق کار کے حوالے سے نہیں دیکھتے‘ صرف تخلیق کے حوالے سے دیکھتے ہیں‘ لہٰذا انہیں اس تخلیق کا کوئی مقصد نظر نہیں آتا اور یہ کائنات بھی ان کے نزدیک ایک بے مقصد شے بن کر رہ جاتی ہے۔

غیر مسلم فلاسفروں اور مفکروں کی حقیقت تک رسائی کی کاوشیں نورِ ہدایت یعنی قرآن وحدیث کے علوم کے بغیر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے سوا کچھ نہیں کہ اندھیر گھٹا ٹوپ طوفانی رات میں بجلی کی چمک کی روشنی میں چند قدم چل لیا اور پھر اندھیرے میں راستہ ٹٹولنے لگ گئے۔

حقیقتِ کائنات‘ خالقِ کائنات سے بڑھ کر کوئی کیسے جان سکتا ہے؟ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ ؕ وَ هُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ ﴿۱۴﴾﴾ (الملک) ’’بھلا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا ہے؟ حالانکہ وہ بڑا باریک بین باخبر ہے‘‘۔ ظاہر ہے جس نے جو چیز بنائی ہے اس سے زیادہ دوسرا کیسے جان سکتا ہے؟ لہٰذا قرآنی حقیقتیں بوقت نزول بھی حقیقتیں تھیں‘ آج بھی حقیقتیں ہیں اور تاابد حقیقتیں رہیں گی۔ سائنسی تحقیق صرف وہی معتبر ہوگی جو قرآنی علم کے مطابق ہوگی‘ مثلاً جب اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَجَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ کُلَّ شَیۡءٍ حَیٍّ ؕ﴾ (الانبیاء: ۳۰) ’’اور ہر زندہ چیز کو ہم نے پانی سے پیدا کیا‘‘ تو سائنسی تحقیق یہاں پہنچ کر رک گئی‘ کیونکہ دونوں کا بیان ایک ہوگیا۔ اب ایسا کوئی ریسرچ پیپر نہیں آئے گا جس سے یہ ثابت ہو کہ زندگی بجلی سے یا مٹی کے تیل سے پیدا ہوتی ہے۔

اسی طرح جب فرمایا کہ اجرامِ فلکی اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں یا یہ فرمایا کہ یہ تمام ایک وقت مقررہ تک چل رہے ہیں‘ یا یہ فرمایا کہ بنیادی طور پر کائنات (زمین وآسمان) ایک وجود کی صورت میں تھی‘ پھر ہم نے اسے پھاڑ کے موجودہ شکل دی۔ اسی طرح کی اور بہت سی آیات ہیں۔ جب جدید سائنسی تحقیقات کی تصدیق ان آیات سے ہوگئی تو ان معاملات میں سائنس کی تحقیق مکمل ہوگئی۔

لیکن ابھی قرآنِ حکیم میں بہت سی ایسی باتیں ہیں‘ جن کا مطلب ہم موجودہ معلومات کے مطابق لیتے ہیں‘ لیکن ان شاء اللہ وقت کے ساتھ ساتھ نئی دریافت شدہ سائنسی حقیقتیں قرآنِ حکیم کی حقانیت کو مزید واضح کردیں گی۔

کسی بھی تفسیرِ قرآن کے صحیح مفہوم تک رسائی اس زبان پر مکمل عبور کے بغیر ممکن نہیں‘ مثلاً ہم اردو زبان سمجھ اور بول سکتے ہیں مگر اردو دانی کا دعویٰ نہیں کرسکتے‘ کیونکہ اس کے لیے اسی علاقے میں جہاں یہ زبان بولی جاتی ہے‘ اس دور کی سماجی‘ سیاسی اور ادبی تاریخ‘ تشبیہات‘

استعارات اور روزمرہ سے مکمل واقفیت بہت ضروری ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ مسلّمہ امر ہے کہ کسی اور زبان میں خواہ کتنا ہی بہتر ترجمہ کرلیا جائے‘ حق ترجمانی ادا نہیں ہوسکتا۔

اب ہر مسلمان تو عربی کی اس سطح کی تعلیم حاصل نہیں کرسکتا‘ لہٰذا یہ اہلِ ذکر اور اربابِ عقل وفکر کی ذمہ داری ہے کہ وہ کلامِ الٰہی کی تفسیر وتشریح اس طرح کریں کہ اہلِ ایمان کی تشنگی دور ہوسکے اور وہ پیغامِ الٰہی کو سمجھ کر اطمینان قلب ونظر کے ساتھ راہِ ہدایت اختیار کرسکیں۔ کیونکہ ہمیں ایسی تفسیر کی اشد ضرورت ہے جو کم علم‘ بے دین اور نام نہاد مسلمانوں کے درمیان پھنسے ہوئے سادہ لوح مسلمانوں کو حقیقت کی روشنی دکھا کر راہِ ہدایت پر ڈال دے تاکہ مسلم اُمّہ پھر سے اپنی عظمتِ رفتہ حاصل کرسکے۔

آج بھی آپ قرآن مجید کی تفاسیر کا مطالعہ کریں تو آپ کے مسائل کا حل یا تو ابن کثیر سے نکلے گا یا شوکانی سے‘ یا امام ابن تیمیہ سے (رحمہم اللہ)۔ اور عصرِ حاضر کے معاملات وحالات کی تشریح و وضاحت اس عہد سے کی جائے گی جہاں وہ لوگ موجود تھے اور کوئی بھی challenging differentiating ہمارے آج کے مسائل اور چیلنجز کے حوالے سے ہمارے سامنے نہیں ہوگی۔

کیا آج اجتہاد وفکر کے دروازے بند ہوگئے ہیں‘ جب کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

﴿وَفَوۡقَ کُلِّ ذِیۡ عِلۡمٍ عَلِیۡمٌ ﴿۷۶﴾﴾ (یوسف)

’’اور ہر علم والے کے اوپر ایک علم والا ہے‘‘۔

ہم سمجھتے ہیں کہ آج کے دور میں قرآن فہمی کے لیے جدید سائنسی علوم کا جاننا بے حد ضروری ہے۔ اس کے بغیر مسلمان اپنے آپ کو ذہنی اور عملی طور پر دورِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں کرسکتے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کسی نے پوچھا کہ آج تو آپ لوگ موجود ہیں جو ہمیں قرآن پڑھا دیتے ہیں‘ سکھا دیتے ہیں‘ اس کی تفسیر بتا دیتے ہیں‘ مگر کل کیا ہوگا؟ جب آپ لوگ نہیں ہوں گے تو قرآن ہمیں کون پڑھائے گا اور کیسے پڑھائے گا؟ آپؓ نے فرمایا: ’’اَلْقُرْآنُ یُفَسِّرُہُ الزَّمَانُ‘‘ کہ ہر زمانہ قرآن کی اپنی تفسیر کرتا ہے۔

حضرت امام زین العابدین رحمہ اللہ کے پاس ایک صاحب گئے اور ان سے سورۃ الحدید کی

ابتدائی آیات کی تفسیر پوچھی: ﴿یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْھَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْھَا ؕ وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ ؕ﴾ (آیت۴) ’’اللہ جانتا ہے جو کچھ زمین کے اندر جاتا ہے اوراس سے باہر نکلتا ہے اور جو آسمانوں سے اترتا ہے اور جو اس پر چڑھتا ہے‘ اور وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں بھی ہو‘‘۔ حضرت امام زین العابدینؒ نے فرمایا کہ یہ تمہیں سمجھ میں نہیں آئیں گی‘ مگر زمانہ آخر میں جو لوگ اللہ عزوجل اوراس کی آیات پر غور و خوض کریں گے تو انہیں یہ آیات بڑی اچھی طرح سمجھ میں آجائیں گی۔

قرآنی الفاظ و تراکیب وہ تراشیدہ ہیرے ہیں‘ جنہیں جس زمانی پہلو سے دیکھیں‘ مطالب ومعانی کی چکاچوند کر دینے والی روشنی آپ کی نگاہوں کو ضرور خیرہ کر دے گی۔

سورۃ الانبیاء کی آیت ۳۰ اور ۳۳ یا سورۃ النور کی آیت ۴۳ میں بیان شدہ الفاظ کے معانی کو جدید سائنسی علوم کی روشنی میں پڑھا جائے تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔قرآن حکیم ایسے الفاظ وتراکیب سے بھرا پڑا ہے۔

اسی طرح احادیث رسولﷺ کا علم بھی فہم قرآن کا لازمی جزو ہے۔سورج کے طلوع و غروب کے متعلق ایک حدیث ملاحظہ ہو۔حضرت ابن عباسؓ جو کائنات میں غور وفکر کرنے والوں میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے‘انہوں نے رسولِ اکرمﷺ سے پوچھا کہ سورج کہاں غروب ہوتا ہے اور کہاں سے نکلتا ہے؟ آپﷺ نے فرمایا کہ ’’سورج بغیر کہیں رُکے حرکت میں رہتا ہے‘ یہ نہ ہی ختم ہوتا ہے‘ نہ غائب ہوتا ہے‘ یہ ایک جگہ پر غروب ہو رہا ہوتا ہے تو دوسری جگہ سے طلوع ہو رہا ہوتا ہے۔لہٰذا کچھ لوگ کہیں گے کہ سورج غروب ہو گیا ہے جبکہ کچھ دوسرے لوگ انہی لمحات میں کہہ رہے ہوں گے کہ سورج ابھی ابھی نکلا ہے‘‘۔روایت امام ابی اسحاق الحمدانی‘ مسند امام ابی اسحاق الحمدانی۔

کیا ہمارے علماء کرام نے قرآن وحدیث کو سامنے رکھتے ہوئے اور دورِ جدید کے اذہان کو مطمئن کرنے کے لیے منبر ومحراب پر اس کو بیان کیا ہے یا سائنس کے طلبہ کو لیکچر دیتے ہوئے کسی پروفیسر صاحب نے اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے قرآن وحدیث کا حوالہ دیا ہے؟ سورۃ الرحمٰن کی مثال لے لیں کہ اس میں ایک آیت مبارکہ بڑے نظم سے دہرائی گئی ہے: ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۴۹﴾﴾ ’’تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟‘‘ آلاء

کے معنی اہلِ لغت اور اہلِ تفسیر نے بالعموم نعمتوں کے بیان کیے ہیں اور بے شک یہ صحیح معنی ہیں۔دوسرے معنی اس لفظ کے قدرت‘ عجائباتِ قدرت یا کمالاتِ قدرت کے ہیں۔ابن جریرؒ نے خود بھی آیات ۳۷‘۳۸ کی تفسیر میں آلاء کو قدر کے معنی میں لیا ہے۔امام رازیؒ نے بھی آیات ۱۵‘۱۶ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ان میں آلاء بیانِ نعمت کے لیے نہیں بلکہ بیانِ قدرت کے لیے ہے۔اس کے تیسرے معنی بھی ہیں ’’خوبیاں‘ اوصافِ حمیدہ‘ کمالات وفضائل‘‘۔اس معنی کو اہل لغت اور تفسیر نے بیان نہیں کیا‘ مگر عربی شاعری میں یہ لفظ کثرت سے استعمال ہوا ہے۔اب اس سورۃ میں آیات کے سیاق وسباق کے حوالے سے ہمیں دیکھنا ہے کہ یہاں آلاء کس معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اسی طرح تُکَذِّبٰنِ یعنی جھٹلانے کے بھی کئی رویے یا طریقے ہیں۔ایک تو کفرانِ نعمت ہے‘ دوسرا اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا سب چیزوں کا خالق ہونے سے انکار کرنا اور یہ عقیدہ رکھنا کہ یہ کائنات یونہی حادثاتی طور پر بن گئی ہے‘ جس میں کسی کی حکمت اور صناعی کا کوئی دخل نہیں۔تیسرا یہ کہ اللہ کے احکامات کو نہ ماننا یعنی خدا کو تو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کی خدائی میں دوسروں کو شریک کرتے ہیں۔یہ بھی تکذیب ہے‘ یعنی لوگ یہ تو مانتے ہیں کہ سب چیزوں کا خالق اور تمام نعمتوں کا دینے والا اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہے مگر اس کے احکامات اور ہدایات کو نہیں مانتے۔یہ تکذیب بالقول نہیں بلکہ تکذیب بالفعل ہے۔ایک تکذیب یہ بھی ہے کہ قرآن حکیم کی کچھ آیات کو سمجھتے اور اس پر عمل بھی کرتے ہیں‘ مگر وہ آیات جن میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے کائنات میں غور وفکر کرنے کا حکم دیا ہے ان سے غفلت برتتے ہیں‘ بلکہ اسے دین کا حصہ ہی نہیں سمجھتے۔نتیجتاً ربِّ ذوالجلال کی حقیقی عظمت وکبریائی کا ادراک کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔یہ حضرات دین اسلام کو عصرِ حاضر کے مادی اور معاشرتی معاملات سے ہم آہنگ نہیں کر پاتے اور اس کم علمی کی بنا پر معرفتِ الٰہی اور مقامِ ربوبیت کے حقیقی ذوق سے ناآشنا رہتے ہیں۔

ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ مذہب سے دوری کا ایک بڑا سبب انسانی فطرت اور تجسس کے زیر اثر ذہن میں ابھرنے والے بنیادی سوالوں کا عام فہم زبان میں مدلّل جواب نہ ملنا بھی ہے۔لہٰذا ہمیں زمانہ حال کے جدید تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے دین کے بارے میں تمام شکوک وشبہات کا ازالہ کر کے نسل نو کے اذہان میں جاگزین متزلزل ایمان کو

پختہ اور یقین کامل کی منزل تک پہنچانا ہے۔ اس ضمن میں اُمتِ مسلمہ کے اہلِ علم پر بہت بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور انہیں اس سلسلے میں کسی قسم کا معذرت خواہانہ رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے‘ کیونکہ سائنس اور دیگر علوم غلط ہو سکتے ہیں لیکن اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی بات غلط نہیں ہو سکتی۔

البتہ ایک بات قابلِ غور ہے کہ ماضی میں بھی اور اب بھی کچھ علماء وفلاسفہ نے تفسیرِ قرآن میں اتنی دست درازیاں اور بے جا جراَتِ خیال سے کام لیا ہے کہ وہ دین اسلام کی بنیادی اساس سے ہی انحراف کر بیٹھے ہیں۔ لہٰذا اس سلسلے میں ہمیں بے حد احتیاط کی ضرورت ہے‘ کیونکہ قرآن کریم میں موجود سائنسی انکشافات خالقِ کائنات کے کمالِ تخلیق اور بنی نوعِ انسان کو فائدہ اُٹھانے کے اشارے ہیں‘ اُس کے الٰہ اور ربّ العالمین ہونے کے چند دلائل ہیں۔ قرآن کوئی انسانی تصنیف شدہ سائنس کی کتاب نہیں‘ چنانچہ قرآنی بیان اور ہماری موجودہ سائنسی معلومات میں کہیں فرق ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری معلومات ناقص ہیں‘ جبکہ قرآنی احکام اٹل اور برحق ہے۔

ہمارا المیہ

دورِ حاضر میں ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے علم کو دو خانوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو مروّجہ معنوں میں ”دینی علوم“ پر اپنی توجہ مرکوز کیے بیٹھے ہیں اور اسے ہی دنیا و آخرت میں کامیابی کے لیے کافی سمجھتے ہیں۔ انہیں یہ باور کرانے کی ضرورت ہے کہ اسلام ایک انقلاب کا نام ہے جسے محض اپنی ذات یا اپنے ملک میں ہی نہیں بلکہ تمام دنیا میں برپا کرنا ہے۔ کرۂ ارض پر غلبۂ دینِ حق اُمتِ مسلمہ کی ذمہ داری ہے جو کہ فی الوقت دینی مدارس میں پڑھائے جانے والے نصاب اور تعلیم وتربیت سے ممکن نہیں۔ ان مدارس میں پڑھنے والے لاکھوں بچوں کا کیا قصور ہے کہ وہ اس مروّجہ تعلیم کی وجہ سے ریاست کے کلیدی‘ مفید اور بااثر عہدوں تک نہیں پہنچ سکتے‘ جبکہ اس صورت میں وہ نفاذِ اسلام کے لیے بہت مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔

ہمیں ان مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کو سائنسی علوم یعنی صحیفۂ کائنات پر پھیلی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی آیات کو سمجھنے اور غور وفکر کرنے کی دعوت دینی چاہیے‘ کیونکہ یہ حکمِ خداوندی ہے۔ ہمیں اسلامی معاشرے میں وہ افراد لانے ہیں جو اپنے خاندان‘ اپنے ملک بلکہ پوری بنی نوعِ انسان

کے لیے فائدہ مند ہوں۔ از روئے حدیث نبویؐ:

((خَيْرُ النَّاسِ اَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ))(رواہ ابن حبان و الطبرانی)

”لوگوں میں بہترین وہ ہے جو لوگوں کے لیے سب سے زیادہ نفع بخش ہے۔“

دوسری طرف وہ اصحاب ہیں جو مروّجہ معنوں میں ”دنیاوی علوم“ کو محض مادی اور فزیکل علوم سمجھ کر اس کائنات کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کر رہے ہیں اور اپنے دین اور ایمان کے بارے میں شک وشبہ کا شکار ہیں۔ انہیں یہ بتایا جائے کہ حقیقت تک رسائی صرف قرآنِ حکیم (جو کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ اور هُدًى لِّلنَّاسِ بھی ہے) اور نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی ہدایات وتعلیمات پر عمل پیرا ہو کر ہی ممکن ہے۔ اگر وہ سائنسی تحقیق وجستجو محض اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا حکم سمجھ کر کریں گے تو یہ ”دنیاوی تعلیم“ بھی ان کے لیے عباداتِ الٰہی کا ایک عظیم ذریعہ بن جائے گی۔ انہیں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی عظمت وکبریائی کا صحیح ادراک ہو جائے گا اور معرفتِ حقیقی جو مقصودِ ربانی ہے‘ اس تک رسائی ہو جائے گی۔ انہیں معلوم ہو جائے گا کہ عالم کا درجہ عابد سے اونچا کیوں ہے؟ کیونکہ تمام رات سبحان اللہ‘ سبحان اللہ کے ورد کی نسبت خالقِ کائنات کی کسی نشانی سے اس کا ادراک کر کے جو منہ سے بے اختیار سبحان اللہ نکلتا ہے‘ اس کا مقام اور لذت ہی کچھ اور ہے۔

ہمارے کرنے کا کام

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دونوں اطراف میں موجود اس خلا کو کس طرح پُر کیا جائے؟ اصل بات تو یہ ہے کہ سمندر اگر سیاہی بن جائیں اور تمام اشجار قلم بن جائیں تو بھی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی حمد وثناء اور ہیبت وکبریائی کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال! ہمیں علماء کرام اور سائنسی علوم کے ماہرین میں ذہنی ہم آہنگی اور ربط قائم کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے عام فہم مضامین‘ مقالہ جات اور لیکچرز کے ذریعے وہ بنیادی سائنسی اور دینی معلومات فراہم کرنا چاہئیں جنہیں علمائے دین اور سائنسی ماہرین اپنے اپنے علم اور استعداد سے مزید بہتر شکل دے کر طالبانِ علم تک پہنچائیں‘ تا کہ ہم سب مسلمان صحیح معنوں میں فہم قرآن کا حق ادا کر سکیں اور مسلم اُمّہ کے مفید افراد بن سکیں۔

❀❀❀

امریکی افواج کا انخلاء اور گریٹر اسرائیل

محمد ندیم اعوان

"Today our way of life is under attack, either you are with us or against us !"

’’آج ہماری تہذیب اور طرز زندگی پر حملہ ہوا ہے' یا تو آپ ہمارے ساتھ ہیں یا ہمارے مخالف !‘‘

گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کو جارج ڈبلیو بش نے غرور و تکبر بھرے لہجے میں دنیا کو مخاطب کر کے دو حصوں میں بانٹ دیا۔ ایک وہ جو یہودی منصوبہ بندی کی امریکی حکمت عملی کا حصہ بنیں گے اور جدید تہذیب کا دفاع اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے کر تن من دھن سے اس مشن میں حصہ لیں گے' اُنھیں اپنے مفادات کی حد تک محبوب رکھا جائے گا' اور دوسرے وہ جو یا تو جدید تہذیب کا مقابلہ کریں گے یا امریکی حکمت عملی کے بارے میں سکوت اختیار کریں گے' مؤخر الذّکر دونوں کو بالتدریج عبرت کا نشان بنا دیا جائے گا۔ لیکن کس کو اس بات کا علم تھا کہ غرور و تکبّر کے نشے میں مدہوش عالمی طاقت کہلانے والا ایسی دلدل میں پھنسنے جا رہا ہے جس میں اس سے قبل زمین پر خدائی کا دعویٰ کرنے والوں کے آثار تا حال موجود ہیں۔

کاش تاریخ کو گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کا دن نہ دیکھنا پڑتا جس کے نتیجے میں ملکوں کے ملک اجڑ گئے' شہر ویران ہوئے' بستیاں برباد ہو گئیں' لاتعداد گھروں کو ملیا میٹ کر دیا گیا' لاکھوں انسانوں کو تہذیبی' معاشی و سیاسی بالادستی کی خاطر بارود سے بھسم کر دیا گیا' جوان لڑکیوں کو اجتماعی تشدد اور ہوس کا نشانہ بنایا گیا' اولاد کے سروں سے والدین کا سایہ چھین لیا گیا' نوجوان نسل کو عبرت کا نشان بنا دیا گیا' اور انسان تو کیا حیوانات' نباتات اور جنگلات تک کو بھی جنگی جنون کی خاطر جل کر راکھ ہونا پڑا۔ کاش! ۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کو وہ ۸۱ مسافر اپنا سفر معطّل یا مؤخّر کر دیتے یا بوسٹن کے لوگن انٹرنیشنل ائیر پورٹ کے بجائے کسی دوسرے ائیر پورٹ کا انتخاب کر لیتے یا اسی ائیر پورٹ سے فلائیٹ AAL 11 کی بجائے دوسری پرواز کو منتخب کرتے تو شاید ۸ بج کر ۴۸ منٹ پر ۸۱

مسافروں سے بھرا جہاز جو لاس اینجلس کی طرف جا رہا تھا رخ بدل کر ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے جا کر نہ ٹکراتا اور آج امریکہ کا رعب و دبدبہ' وقار اور بین الاقوامی بالادستی بدستور قائم رہتی' اُسے سترہ سال تک ذلت و رسوائی کا سامنا نہ کرنا پڑتا اور آخر کار افغانستان کی خاک پر ناک رگڑتا واپس لوٹنے کا فیصلہ نہ کرتا۔ لیکن یہ تو ہونا ہی تھا' کیونکہ آسمانی رزق من و سلویٰ کھانے والی قوم کی منصوبہ بندی نے امریکا کو آرام سے بیٹھنے کب دیا اور وقتاً فوقتاً اُسے اپنی جھوٹی شان اور بالادستی کی خاطر بیک وقت مختلف ممالک سے جنگوں میں دھکیلتے گئے اور اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے امریکا کو کٹھ پتلی کی طرح اپنے اشاروں پر نچاتے رہے —— اور آج امریکا کو فوجی' سیاسی اور معاشی طور پر کمزور کرنے کے بعد واپس لوٹنے کا حکم صادر فرمایا' جس پر عمل درآمد کیے بغیر امریکا کے پاس کوئی دوسرا آپشن موجود نہیں۔ اس کے نتیجے میں ۱۶ دسمبر کو ابوظہبی میں امریکا اور افغان طالبان کے مابین براہِ راست مذاکرات ہوئے اور پھر افغانستان میں موجود امریکی سفارت خانے کی طرف سے افواج کی واپسی کا اعلامیہ جاری کر دیا گیا۔ یہ ایک طرف تو افغان مجاہدین کی فتح کا اعلان ہے تو دوسری طرف امریکا کی خود مختاری پر سوالیہ نشان ہے۔

موجودہ صورتحال کا تجزیہ کرنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ کن مفادات اور مقاصد کے پیش نظر امریکا نے افغانستان میں قدم رکھا تھا؟ کیا امریکا افغانستان میں اپنے مفادات کے حصول میں کامیاب ہوا؟ اگر ہاں تو افغان طالبان سے براہِ راست مذاکرات کی بھیک مانگنے کو آپ کیا نام دیں گے؟ یہاں تک کہ اپنے ہی جگری یاروں یعنی کابل کی کٹھ پتلی حکومت کی حاضری کو بھی ضروری نہیں سمجھا۔ اور اگر امریکا اپنے مفادات کے حصول میں اب تک ناکام رہا ہے تو کس کے ایماء پر اپنی قومی غیرت کا جنازہ نکالنے اور ’’سب سے پہلے امریکا‘‘ کے نعرے کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہے اور افغانستان سے کوچ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟ اس کا ایک انتہائی آسان اور سیدھا سادھا جواب ہے کہ امریکی معیشت خود تو بیساکھیوں پر کھڑی ہے اور امریکا مزید جنگوں میں جانی و مالی نقصان کا متحمل نہیں ہے۔ اس کے پاس جنگوں پر خرچ کرنے کے لیے اخراجات کا فقدان ہے اور امریکی معیشت کی پشت پر کارفرما یہودی لابی افغانستان میں مزید اپنا سرمایہ اور وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی' کیونکہ دنیا پر خدائی نظام کی مانند ایک عالمی نظام نافذ کرنے کا خواب دیکھنے والے نظریاتی یہودیوں کو امریکا کے اکتالیسویں صدر سینئر بش (جارج ہربرٹ والکر بش) کا ۱۹۹۲ء میں بنایا گیا منصوبہ سترہ سال کے جانی و مالی نقصانات

کے باوجود بھی ناکام دکھائی دے رہا ہے۔ لہٰذا ڈونلڈ ٹرمپ جو بالواسطہ اور بلاواسطہ یہودی لابی کے لیے ایک مہرے کے طور پر امریکا کی صدارت پر براجمان ہے' نے صدارت سنبھالتے ہی فوج کو واپس بلانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا' جس پر عمل درآمد کے لیے گزشتہ ماہ افغانستان میں موجود امریکی سفارت خانے کی طرف سے اعلامیہ بھی جاری ہو چکا ہے اور آئندہ ماہ و سال میں اسے عملی جامہ پہنانے کے امکانات بھی واضح دکھائی دے رہے ہیں۔

میرے اس موقف سے یقیناً بعض حضرات کو اختلاف ہو سکتا ہے کہ فلسطین میں غیر قانونی سکونت اختیار کرنے والے صرف پینسٹھ لاکھ یہودی عالمی طاقت امریکا کو کیسے مجبور کر سکتے ہیں' کیونکہ امریکا تو جمہوریت کا علمبردار ہے اور ڈونلڈ ٹرمپ اپنے تمام تر اختیارات کو استعمال کرنے کے باوجود بھی جمہوری اقدار کو پامال نہیں کر سکتا' اور اگر وہ چاہے بھی تو کابینہ میں ایسے افراد ضرور پائے جاتے ہوں گے جو ٹرمپ کے ایسے اقدامات کو ہرگز قبول نہیں کریں گے جس سے امریکی بالادستی اور مفادات پر زد پڑتی ہو۔ امریکی خودمختاری کس طرح یہودی لابی کے پنجے میں ہے اور کابینہ' سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں پھیلے یہودی اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے امریکی فیصلوں پر کیسے اور کس حد تک اثر انداز ہوتے ہیں' یہ حیرت انگیز انکشافات پر مبنی ایک دلچسپ تاریخ ہے' جس کا اندازہ آپ تاریخ کے چند واقعات سے بخوبی لگا سکتے ہیں۔

جارج ایچ ڈبلیو بش (۱۹۸۹ء تا ۱۹۹۳ء) جو امریکا کا اکتالیسواں (۴۱) صدر تھا' اس کا خاندانی پیشہ تیل کا کاروبار تھا۔ یہ لوگ امریکا کی سب سے بڑی ریاست ٹیکساس کے رہنے والے ہیں جسے امریکی تیل کا دارالحکومت بھی کہا جاتا ہے۔ چونکہ اُس زمانے میں امریکا تیل کا سب سے بڑا درآمد کنندہ تھا اور اُس کی اپنی پیداوار استعمال کے صرف بیس فیصد کے برابر تھی' باقی سعودی عرب' میکسیکو اور وینزویلا سے درآمد کیا جاتا تھا' اس لیے ریاست ٹیکساس میں تیل کے کاروبار سے وابستگی کے باوجود جارج ڈبلیو بش نے دنیا بھر کے تیل پر قبضہ جمانے کے لیے ایک منصوبہ بنایا اور ۱۹۹۲ء میں تیل کی تین بڑی کمپنیوں کے سربراہان کو واشنگٹن میں جمع کیا۔ خلائی اسٹیشنوں سے کھینچی گئی تصاویر سکرین پر چلائی گئیں اور اپنی چھڑی سے آذربائیجان' قازقستان' ترکمانستان اور ازبکستان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ان چار ملکوں کے نیچے پانچ کھرب ڈالر کا تیل اور گیس پوشیدہ ہے جس پر میں قبضہ کرنا چاہتا ہوں' کون میرا پارٹنر بننا پسند کرے گا؟ تمام کمپنیوں کے سربراہان نے ہاتھ کھڑے کر دیے۔ مذاکرات ابھی حتمی شکل

اختیار نہیں کر پائے تھے کہ سینئر بش کی حکومت ختم ہو گئی۔ تاہم مذاکرات پھر بھی جاری رہے۔ اسی دوران اسرائیل کی خفیہ ایجنسی موساد کو ان تمام سرگرمیوں کی اطلاعات موصول ہوئیں اور وہ بھی متحرک ہو گئی۔ اب موساد کو یہاں پر دو چیلنجز کا سامنا تھا۔ ایک نئے منتخب ہونے والے امریکا کے بیالیسویں صدر کو اپنے حصار میں لینا' کابینہ اور اردگرد تمام سرکاری اور حساس اداروں تک رسائی حاصل کرنا اور دوسرا دنیا بھر میں تیل کے ذخائر پر قبضہ کرنا۔ آپ یہ جان کر چونک اٹھیں گے کہ تقریباً ایک سال سے بھی کم عرصے کے دوران یہودیوں نے بل کلنٹن کے گرد ایک مضبوط حصار قائم کر دیا' مثلاً کلنٹن کا وزیر خارجہ میڈلین البرائٹ' نائب وزیر خارجہ سٹینلے ارتھ' وزیر دفاع ولیم کوہن' وزیر خزانہ لارنس سمرز' نائب وزیر خزانہ سٹورن آئزن ٹیسٹ' اقوام متحدہ میں امریکا کے سفیر رچرڈ ہال بروک' نیشنل سیکیورٹی کا سربراہ سینڈل برگر' چیف آف سوشل سیکیورٹی کینتھ ایفل' ٹریڈ کا نمائندہ چارلس برشیفکی' ڈائریکٹر سی آئی اے ڈیوڈ کوہل' آئی بی ڈائریکٹر ہال آئزنز' کمیونیکیشن ڈائریکٹر رابی اموئیل راہم' نیشنل ہیلتھ کیئر ایڈوائزر تھامس ریپٹن' ڈائریکٹر مینجمنٹ آف بجٹ ایلیس ریولن' اکنامک پالیسی کا ایڈوائزر صتیلیے پوسکن' یہاں تک کہ خود کلنٹن اور ہیلری کا ذاتی سٹاف تک یہودی تھا' لہٰذا صدر اور خاتونِ اول کی نجی اور سرکاری مصروفیات کا تمام تر شیڈول یہی لوگ بناتے تھے۔ یہ دور یہودیوں کے لیے انتہائی سنہری دور تھا جس میں خوب کھل کر امریکی انتظامیہ' مقننہ اور عدلیہ کے ذریعے اپنی پالیسیوں کو عملی جامہ پہناتے رہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ تین فیصد امریکی یہودی ستانوے فیصد امریکیوں اور سو فیصد دنیا کے مالک بنے بیٹھے ہیں اور یہ تمام یہودی انتہائی درجہ کے متعصب' بنیاد پرست اور نظریاتی تھے۔

دوسری طرف دنیا بھر کے تیل کے ذخائر پر قبضہ کرنے کے لیے موساد نے یوسف اے میمن کو ترکمانستان میں تعینات کیا۔ یوسف اے میمن موساد سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد اسرائیل کی ایک آئل کمپنی مہیرو گروپ کا صدر تھا۔ اُس وقت ترکمانستان کے صدر نیازوف نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے یوسف اے میمن کو نہ صرف ترکمانستان کی شہریت دی بلکہ اسے آئل اینڈ گیس کا مشیر اور خصوصی سفیر بنا دیا اور یوں ترکمانستان کے تیل پر اسرائیل کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ تیل کے دیگر تجارتی معاہدوں کے ذریعے یوسف اے میمن نے آذربائیجان کے تیل کے ذخائر تک بھی رسائی حاصل کر لی۔ ادھر سینئر بش کے تیل

کی بڑی کمپنیوں کے ساتھ مذاکرات کے نتیجے میں امریکا کی دیگر آئل کمپنیوں نے بھی ترکمانستان اور قازقستان میں مجموعی طور ۴۳ ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کی تھی اور پاکستان سے افغانستان اور افغانستان سے ترکمانستان گیس پائپ لائنز بچھانے کی سرمایہ کاری اس کے علاوہ تھی۔ اس صورتحال نے اسرائیل اور بش خاندان کو ایک دوسرے کے مدِمقابل لا کھڑا کیا‘ کیونکہ تیل کے ذخائر پر قبضہ کرنا دونوں کا مقصد تھا۔

بش خاندان نے جب سینٹرل ایشیا کے تیل کو یورپ اور امریکا پہنچانے کے بارے میں سوچا تو اُس کے صرف تین راستے تھے۔ پہلا راستہ ترکمانستان‘ قازقستان‘ ازبکستان اور آذربائیجان سے روس اور روس سے یورپ۔ دوسرا ان چار ممالک سے ایران‘ ایران سے بحیرۂ عرب اور وہاں سے یورپ اور امریکا۔ اور تیسرا ان چار ممالک سے افغانستان‘ افغانستان سے پاکستان‘ بھارت اور وہاں سے بحر ہند سے یورپ اور امریکا۔ روس کے صاف انکار کر دینے پر صرف دو آخری آپشن تھے‘ لیکن چونکہ امریکا ایران پر اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے اُن کے پاس صرف ایک ہی راستہ بچا۔ اُس راستے میں جو سب سے بڑا خطرہ تھا وہ ’’افغان طالبان کا انقلاب‘‘ تھا۔ چنانچہ سینئر بش نے دو جون ۲۰۰۰ کو امریکا میں تیل کمپنیوں کے بڑے بڑے مالکان کو کھانے پر بلایا اور اُن کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اگر میرے بیٹے (جارج ڈبلیو بش) کو امریکا کا صدر منتخب کروا دیا جائے تو ہم پانچ کھرب تیل کے ذخائر آپ کی جھولی میں ڈالنے کے لیے تیار ہیں۔ کمپنیوں کے مالکان نے جب گارنٹی مانگی تو بش نے اُنہیں یہ پیش کش کی کہ حکومت تشکیل پاتے ہی آپ تمام کو کابینہ کے ارکان کے طور پر لے لیا جائے گا۔ بس پھر کیا تھا تیل کمپنیوں کے مالکان نے ڈالروں کی بارش کر دی اور ہر طرف بش خاندان کا ڈنکا بجنے لگا۔ ٹیلی ویژن‘ ریڈیو‘ اخبارات‘ رسائل و جرائد میں اشتہارات کی بھرمار ہوئی‘ یہاں تک کہ پانامہ اور ایتھوپیا جیسے بدحال ممالک کے اخبارات میں بھی بش کی حمایت میں مضامین چھپائے گئے اور اس مہم کے نتیجے میں بش خاندان ایک بار پھر وائٹ ہاوس میں داخل ہو گیا۔ وعدے کے مطابق تیل کمپنی کے مالکان کو وزیر داخلہ‘ وزیر خارجہ‘ وزیر توانائی اور دیگر حساس نوعیت کے سرکاری عہدے سونپ دیے گئے۔ الیکشن مہم میں سب سے زیادہ چندہ دینے والی آئل کمپنی ’’ایزون‘‘ کے وائس چیئرمین تھامس وائٹ کو امریکا کی سب سے مضبوط وزارت وزارت افواج کا سربراہ مقرر کیا گیا۔

بش خاندان چونکہ مذہباً عیسائی تھا اور یہ لوگ ہر اتوار کو باقاعدگی اور اہتمام سے چرچ بھی جایا کرتے تھے‘ بلکہ سینئر بش کے بارے میں تو یہاں تک بیان کیا جاتا ہے کہ یہ یہودیوں کا سخت مخالف اور فلسطین کے مسئلے پر عربوں کا حامی تھا۔ اس لیے عربوں کا خیال تھا کہ جونیئر بش صدر منتخب ہونے کے بعد فلسطین کے مسئلے میں ہماری حمایت کرے گا اور مشرق وسطیٰ میں امن قائم ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جارج ڈبلیو بش کی الیکشن مہم کے لیے عربوں نے ڈیڑھ ملین ڈالر چندہ دیا تھا جو الیکشن مہم کے اخراجات کا تقریباً نصف بنتا تھا۔

کامیاب مہم کے نتیجے میں جب جارج ڈبلیو بش امریکا کا ترالیسواں (۴۳) صدر منتخب ہوا اور اُس نے اپنی کابینہ کا اعلان کیا تو اُس میں یہودیوں کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر تھی اور یہ یہودیوں کے لیے شدید سیاسی جھٹکا تھا۔ اس سے قبل چونکہ امریکی معیشت پر یہودی پوری طرح قابض ہو چکے تھے‘ لہٰذا بش حکومت کے لیے مشکلات پیدا کرنا اُن کے لیے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ چنانچہ تمام یہودیوں نے شٹر ڈاؤن کر کے بش حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا اور سٹاک ایکسچینج اپنی آخری حد تک گر گیا‘ کارخانوں کو تالے لگا دیے گئے‘ صنعت و حرفت کا پہیہ رک گیا‘ یہاں تک کہ ۴ جولائی ۲۰۰۱ کو جشن آزادی کے لیے آتش بازی کا سامان چین سے منگوانا پڑا جس کی وجہ سے بش حکومت کو ۱۲۵ ملین ڈالر کا خسارہ برداشت کرنا پڑا۔

یہودیوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ موساد نے اپنے ۱۲۰ اعلیٰ تربیت یافتہ افراد کو ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے کی منصوبہ بندی میں لگا دیا جو بعد میں امریکی تحقیقات کے خفیہ ادارے سی آئی اے کی تفتیشی کارروائیوں کے نتیجے میں گرفتار بھی ہوئے‘ لیکن تاریخ مزید اس حوالے سے خاموش ہے۔ دوسری جانب امریکا کی الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کی تمام بڑی کمپنیاں جن کے مالکان کٹر متعصب یہودی تھے‘ نے اپنی توپوں کا رخ بش حکومت کی طرف کر دیا۔ میڈیا پر اُسامہ بن لادن کو بنیاد بنا کر افغان طالبان اور اسلامی سزاؤں کے خلاف پُرزور پروپیگنڈا کا آغاز کر دیا گیا‘ جس کے نتیجے میں امریکی عوام کے دلوں میں طالبان کو انسانیت اور امریکی تہذیب کا دشمن بنا کر پیش کیا گیا اور ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت امریکی عوام کی طرف سے یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ ’’طالبان کو سبق سکھانا چاہیے۔‘‘

طالبان حکومت کے بعض لوگ اس منصوبہ کے پیچھے خفیہ عزائم کو بھانپ گئے تھے‘ لہٰذا انہوں نے تعلقات عامہ کی ماہر خاتون اور سی آئی اے کے سابق سربراہ رچرڈ ہیلمز کی بھتیجی لیلیٰ

ہیلمز نامی خاتون کو باقاعدہ معاوضہ دے کر خدمات حاصل کیں۔ لیلیٰ ہیلمز کی کوششوں سے امریکی انتظامیہ طالبان کے نمائندوں سے گفتگو کے لیے تیار ہوگئی اور مارچ ۲۰۰۱ء کو طالبان حکومت کے مشیر سید رحمت اللہ ہاشمی پانچ روزہ دورے پر واشنگٹن گئے' جہاں ان کے سامنے صلح کی صرف ایک ہی شرط رکھی گئی کہ افغانستان میں لبرل اور ماڈریٹ حکومت تشکیل دی جانی چاہیے' بصورت دیگر امریکا افغانستان پر حملہ کر دے گا۔ ۲اگست کو اسلام آباد میں موجود افغان سفیر کے ذریعے طالبان کو آخری وارننگ دی گئی' لیکن طالبان نے امریکی دھمکیوں کو نظر انداز کر دیا۔ جونیئر بش افغانستان پر حملے کا اس لیے بھی خواہش مند تھا کہ ایک طرف تو اُس کے والد سینئر بش کے منصوبے کے تحت تیل کے ذخائر پر قبضہ کر لیا جائے گا تو دوسری طرف عوام میں بش حکومت کی پذیرائی بھی ہوگی اور صنعت و حرفت کا پہیہ بھی چلنے لگے گا۔ بش حکومت نے ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے کا شاید سوچا بھی نہ تھا۔ یہ تو موساد کے ایک سو بیس اعلیٰ تربیت یافتہ جاسوسوں کو ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے کی منصوبہ بندی کا جو ٹاسک دیا گیا تھا وہ پورا ہوا اور پھر دنیا نے گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کا دن بھی دیکھا کہ دنیا کا بلند ترین تجارتی مرکز جس کی تکمیل چند ماہ قبل ہی ۲۶/اپریل ۲۰۰۱ء کو ہوئی تھی' جس میں روزانہ ساڑھے آٹھ ارب ڈالر کا بزنس ہوتا تھا اور جسے ننانوے سال کے لیے تین ارب بیس ملین ڈالر کی لیز پر ''سلور اسٹیشن پراپرٹیز'' اور ''ویسٹ فیلڈ امریکا'' نے حاصل کیا تھا' زمین بوس ہوگیا۔

اس حملے سے بش خاندان حواس باختہ ہو کر اپنی تمام تر انتظامی صلاحیتیں گنوا بیٹھا اور افغانستان پر چڑھ دوڑا اور اس طرح یہودی لابی نے امریکا کو ایک نہ ختم ہونے والی طویل جنگ میں جھونک دیا۔ ایک طرف بش حکومت پہلے ہی سے غیر مستحکم حالات اور ہچکولے کھاتی معیشت کا شکار تھی تو دوسری طرف افغان جنگ سے یہودی لابی نے نہ صرف امریکی معیشت کو دیوالیہ کر دیا بلکہ ریکارڈ حد تک ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف جیسے اداروں کا مقروض بھی بنا دیا۔ اور یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ دونوں ادارے عالمی سودی مالیاتی نظام کی تشکیل کا سرچشمہ ہیں جس کے تحت ممالک کو مقروض بنا کر جکڑ لیا جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ امریکا پر مجموعی طور بائیس کھرب ڈالر کا قرضہ چڑھ چکا ہے جو اوسطاً امریکا کے ہر فرد پر ایک کروڑ روپے بنتے ہیں۔

اس کے علاوہ عراق امریکا جنگ میں بھی اُن ۳۲ یہودیوں کے مرکزی کردار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا' جو ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے کے بعد بش انتظامیہ اور تمام اہم اور کلیدی عہدوں تک

رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ یہی وہ یہودی تھے جو اُس وقت تمام امریکا کے سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے تھے اور تمام پالیسیوں کو تشکیل دے رہے تھے۔ ان میں سے ایک رچرڈ پرل تھا جو پینٹاگون کے ڈیفنس پالیسی بورڈ کا چیئر مین اور خارجہ پالیسی کے سلسلے میں بش کا مشیر تھا۔ اس سے قبل رچرڈ اسرائیل کی اسلحہ ساز فیکٹری ''سولٹم'' میں ملازم تھا۔ دوسرا شخص پال ولف اوٹس جو امریکا کا نائب وزیر دفاع اور رچرڈ کے ڈیفنس پالیسی بورڈ کا ممبر تھا۔ یہ وہ شخص ہے جس کے اسرائیل سے خفیہ تعلقات کی خبریں متعدد بار امریکی اخبارات میں شائع ہوئیں۔ تیسرا شخص ڈگلس فیتھ تھا جو دفاع کا انڈر سیکریٹری اور پینٹاگون میں پالیسی ایڈوائزر تھا۔ یہ شخص ایک متعصب یہودی تھا جو عرب مخالف پالیسیوں کی بنا پر امریکا میں خاصا مقبول تھا اور یہودیوں کی بدنام زمانہ تنظیم زائی نسٹ آرگنائزیشن آف امریکا میں بھی شامل رہا۔ چوتھا شخص ایڈورڈ لٹوا جو پینٹاگون میں قائم سکیورٹی اسٹڈی گروپ کا ممبر تھا۔ یہ ایک نظریاتی اور انتہا پسند یہودی تھا جس کی تعلیم و تربیت تل ابیب میں ہوئی اور اخبارات میں مسلسل اسرائیل کی حمایت میں مضامین بھی لکھتا رہا۔ اگلا شخص ڈوزاخم جو دفاع کا انڈر سیکریٹری اور محکمہ دفاع کا چیف فنانشل آفیسر تھا۔ یہ شخص بھی نسلاً یہودی ہے اور امریکا کے ساتھ ساتھ اسرائیل کی شہریت بھی رکھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جب تک مسلمانوں کی طاقت ختم نہیں ہو جاتی یہودیوں کا عروج شروع نہیں ہوسکتا۔ کینتھ ایڈولمین پینٹاگون میں مشیر تھا اور رچرڈ کے ڈیفنس پالیسی بورڈ کا ممبر بھی تھا۔ یہ بھی ایک انتہائی متعصب اور انتہا پسند یہودی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر دنیا امن چاہتی ہے تو مسلمانوں کی بیخ کنی کرنی ہوگی اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو مسلمانوں کو اُس جگہ پر رکھنا چاہیے جہاں لوگ پرانے غلاموں کو رکھا کرتے تھے۔ اس شخص کو آپ ہمیشہ کی طرح بین الاقوامی ٹیلی ویژن چینل ''فاکس'' پر عربوں اور مسلمانوں کے خلاف گفتگو کرتا پائیں گے۔ لیویز لیبی امریکا کے نائب صدر ڈک چینی کا چیف آف سٹاف تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر دنیا سے دہشت گردی کو ختم کرنا ہے تو جہاد کے جذبے کو مٹانا ہوگا۔ رابرٹ سٹالوف امریکی قومی سلامتی کا مشیر تھا جو اس سے قبل اسرائیل کے تھنک ٹینک ''واشنگٹن انسٹی ٹیوٹ فار نیئر ایسٹ'' کا ڈائریکٹر تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ عربوں کا تیل بنیادی طور پر یہودیوں کی جاگیر ہے لیکن مسلمان اسے استعمال کر رہے ہیں۔ یہ سراسر بے ایمانی ہے اور ایک دن یہودی اپنا حق لے کر ہی رہیں گے۔ الیٹ ابرامز کا شمار بھی انتہا پسند یہودیوں میں ہوتا ہے اور یہ شخص اُس دور میں نیشنل

سکیورٹی کونسل کا مشیر تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اُس وقت تک دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا جب تک وہ تمام ذرائع مسدود نہ کر دیے جائیں جن سے اُسامہ بن لادن جیسے لوگ پیدا ہوتے ہیں۔

پس منظر کے طور پر عرض کیا جاتا ہے کہ بش کو عراق پر حملے کی چنداں ضرورت نہیں تھی‘ کیونکہ عرب حکمرانوں کی تمام دولت امریکا میں ہے اور امریکا کو تیل کی ترسیل روک کر وہ اپنے اربوں کھربوں ڈالر کو خطرے میں نہیں ڈال سکتے‘ لیکن یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وزارتِ خارجہ اور ڈیفنس جیسے حساس اداروں پر انتہا پسند اور متعصب یہودی تعینات ہوں جو برسوں سے مسلمانوں کے زوال اور بیخ کنی کے منتظر تھے اور جونیئر بش (جارج ڈبلیو بش) کو عراق پر حملہ کرنے کی تجویز نہ دیں‘ بلکہ مجبور نہ کریں۔ اس بات کا اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں کہ ان حضرات کے ہوتے ہوئے امریکی صدر جارج ڈبلیو بش عراق پر حملہ کرنے سے کیسے انکار کر سکتا تھا‘ جب کہ صدر بش کو اپنے آگے اور پیچھے دونوں طرف موت منڈلاتی دکھائی دے رہی تھی اور اُسے اس بات کا بخوبی علم تھا کہ امریکا کے سولھویں صدر ابراہم لنکن اور بیسیویں صدر جیمز گارفیلڈ عالمی مالیاتی نظام‘ جسے براہِ راست یہودی کنٹرول کرتے ہیں‘ میں رخنہ ڈالنے کے سبب قتل کیے جا چکے ہیں‘ اس لیے وہ کسی بھی صورت میں اپنی جان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔

یہودی اگر امریکا کو عراق اور شام کے خلاف جنگ کرنے پر اُبھارتے ہیں اور حملہ کرنے پر مجبور کرتے ہیں تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایسا کرنے سے یہودیوں کے گریٹر اسرائیل (جو مصر کے نیل سے لے کر فرات کے کنارے تک پھیلا ہوا ہے اور جس میں اردن سمیت سعودی عرب کا شمالی علاقہ‘ نصف عراق اور پورا شام شامل ہے) کا خواب تکمیل تک پہنچتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہودی لابی نے امریکا کو افغانستان کی دلدل میں کیوں دھکیلا؟ تو اس بات کو رسول اللہ ﷺ کی حدیث سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ سنن ابن ماجہ میں حضور ﷺ سے ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ ’’جب تم دیکھو کہ خراسان کی جانب سے سیاہ جھنڈے نکل آئے ہیں تو اس لشکر میں شامل ہو جاؤ‘ چاہے تمہیں اس کے لیے برف پر گھسٹ کر کیوں نہ جانا پڑے‘ کہ اس لشکر میں اللہ کے آخری خلیفہ مہدی ہوں گے‘‘۔ اس وقت تو پوری دنیا میں ’’خراسان‘‘ نام کے کسی ملک کا وجود نہیں ملتا‘ لیکن صدیوں پہلے یہ ملک افغانستان‘ ایران‘ پاکستان اور وسط ایشیائی ریاستوں تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ تمام وہ علاقہ ہے جس کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ امام مہدی علیہ السلام کی مدد کے لیے یہاں سے کالے جھنڈے لے کر مسلمان فوجیں چلیں گی اور اُن

کا راستہ کوئی نہیں روک سکے گا یہاں تک کہ وہ کالے جھنڈے ایلیاء (بیت المقدس) میں نصب کیے جائیں گے۔ اور چونکہ یہی علاقے یہودی لابی کے عالمی غلبے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں‘ اس لیے یہودی امریکا کو افغانستان کی جنگ میں دھکیل کر خراسان کے علاقوں کو کمزور کرنا چاہتے تھے اور ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے تھے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ افغانستان کے ساتھ متصل پاکستان کی حدود شروع ہوتی ہیں اور کُرۂ ارض پر صرف دو ہی نظریاتی ریاستیں وجود رکھتی ہیں ایک پاکستان اور دوسرا اسرائیل۔ چونکہ پاکستان دو قومی نظریہ اور لا الٰہ اِلا اللہ کی بنیاد پر وجود میں آیا ہے جو یہودیوں کے عالمی نظام کے بالکل متصادم ہے‘ لہٰذا اسرائیل کیسے اپنے نظریاتی حلیف کو بھول سکتا ہے؟ اس کا برملا اظہار اُن کے سرکردہ رہنماؤں نے کئی بار اپنے نظریاتی کارکنان کے سامنے کیا ہے‘ تاکہ وہ اپنے ٹارگٹ کو کسی بھی حالت میں بھولنے نہ پائیں۔ ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں جب اسرائیل کو فتح ہوئی تو کامیابی کا جشن منانے کے لیے اسرائیل کے پہلے وزیر اعظم ڈیوڈ بن گوریان نے پیرس (فرانس) کا انتخاب کیا اور سار بون یونیورسٹی میں ممتاز یہودیوں کے ایک اجتماع سے تقریر کرتے ہوئے کہا:

> *The World Zionist Movement should not be neglectful of the dangers of Pakistan to it. And Pakistan now should be its first target, for this ideological state is a threat to our existence. And Pakistan, the whole of it, hates the Jews and loves the Arabs. This lover of the Arabs is more dangerous to us than the Arabs themselves. For that matter, it is most essential for the world Zionism that it should now take immediate steps against Pakistan. Whereas the inhabitants of the Indian peninsula are Hindus whose hearts have been full of hatred towards Muslims, therefore, India is the most important base for us to work there from against Pakistan. It is essential that we exploit this base and strike and crush Pakistanis, enemies of Jews and Zionism, by all disguised and secret plans ......*

’’بین الاقوامی صیہونی تحریک کو کسی بھی طرح اپنے لیے پاکستان کے خطرات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اور پاکستان اب اس کا اولین ہدف ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ نظریاتی

ریاست ہمارے وجود کے لیے خطرہ ہے۔ (پاکستان کا ذہنی وفکری سرمایہ اور جنگی و عسکری قوت و کیفیت آگے چل کر کسی بھی وقت ہمارے لیے باعث مصیبت بن سکتی ہے۔) پاکستان کُل کا کُل یہودیوں سے نفرت اور عربوں سے محبت کرتا ہے۔ عربوں سے محبت کرنے والا یہ ملک ہمارے لیے خود عربوں سے زیادہ خطرناک ہے۔ چنانچہ عالمی صہیونیت کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف فوری طور پر اقدامات کرے۔ جبکہ جزیرہ نمائے ہند کے رہنے والے ہندو ہیں‘ جن کے دل مسلمانوں کے خلاف نفرت سے بھرے ہوئے ہیں۔ چنانچہ پاکستان کے خلاف کام کرنے کے لیے بھارت ہمارے لیے اہم ترین اڈہ ثابت ہو سکتا ہے۔ ہمارے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم اس اڈے کو اپنے تصرف میں لا کر فائدہ اٹھائیں اور اپنے تمام خفیہ اور پوشیدہ منصوبوں کے ذریعے پاکستانیوں کو نشانہ بنا کر انہیں نیست و نابود کر دیں جو یہودیوں اور صہیونیت کے دشمن ہیں۔ بھارت سے دوستی ہمارے لیے نہ صرف ضروری ہے بلکہ مفید بھی ہے۔ ہمیں اس تاریخی عناد سے لازماً فائدہ اٹھانا چاہیے جو ہندو پاکستان اور اس میں رہنے والے مسلمانوں کے خلاف رکھتا ہے۔ یہ تاریخی دشمنی ہمارے لیے زبردست سرمایہ ہے‘ لیکن ہماری حکمت عملی ایسی ہونی چاہیے کہ ہم بین الاقوامی دائروں کے ذریعہ ہی بھارت کے ساتھ اپنا ربط وضبط رکھیں۔‘‘ (یروشلم پوسٹ‘ ۹ اگست ۱۹۶۷ء)

تقریر کے مندرجہ بالا اقتباس میں ڈیوڈ بن گوریان نے اپنے ممتاز یہودیوں کو پاکستان کے مسلمانوں اور انڈیا کے ہندوؤں کے درمیان نفرت کو بہترین اور کارآمد ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کی تجویز بھی پیش کی ہے۔ اور کون نہیں جانتا کہ آج افغانستان میں انڈیا کے ایک سو سے زائد مراکز ہیں جہاں افراد کو پاکستان میں تخریبی کارروائیوں کے لیے ٹریننگ دی جاتی ہے۔ آرمی پبلک سکول جیسے واقعات اسی کا شاخسانہ ہیں۔ لہٰذا افغانستان کے راستے پاکستان کے امن کو سبوتاژ کرنا ہمیشہ سے یہود کے ایجنڈے کا حصہ رہا ہے اور کئی بار کوششیں بھی کی جا چکی ہیں‘ لیکن اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے ہر بار انہیں منہ کی کھانی پڑتی ہے۔ مثلاً ۲۷ مئی ۱۹۹۸ء کو پاکستان کے ایٹمی پلانٹ کو تباہ کرنے کے لیے بھارت کے ایئر پورٹ پر اسرائیلی جہازوں کا پایا جانا‘ لیکن پاکستان کے انٹیلی جنس اداروں اور پاک فضائیہ کی بروقت کارروائی نے اس منصوبے کو ناکام بنا دیا۔ پاکستان میں یہودیوں کی مداخلت اور اقدامات کی بھی ایک دلچسپ داستان ہے جس پر‘ ان شاء اللہ‘ آئندہ لکھا جائے گا۔

بہرحال افغانستان سے غاصب امریکی انخلاء یقیناً افغان مجاہدین کی استعمار سے جاری سترہ سالہ جنگ میں ایک عظیم الشان فتح ہے‘ جس پر افغان مجاہدین مبارک باد کے مستحق ہیں اور اُن کے صبر اور ہمت و حوصلے کی دل کھول کر داد دینی چاہیے‘ جو تقریباً سترہ سال تک مشترکہ مسلح افواج سے برسرپیکار رہے اور اسلامی نظام پر کسی بھی قسم کا سمجھوتہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ لیکن کیا اسے محض اتفاق کا نام دیا جا سکتا ہے کہ امریکا جو سالوں سے شام کی سرزمین پر دولت اسلامیہ داعش کو کچلنے‘ ایران کا راستہ روکنے اور شام میں ایرانی فوج کے اثر و رسوخ کو محدود کرنے کے لیے کود پڑا تھا‘ اسے اب اچانک انخلاء کا فیصلہ کیوں کرنا پڑا ہے جس پر عمل درآمد بھی افغانستان سے قبل ہی شروع ہو چکا ہے‘ جبکہ شام میں تاحال داعش کا وجود کثیر تعداد میں باقی ہے۔ اور ایران کے اثر و رسوخ کی صورتحال تو یہ ہے کہ جہاں جہاں داعش کا قبضہ تھا وہاں ایران نے روس کے ساتھ مل کر حزب اللہ کو اُتار دیا ہے اور اس وقت شام میں ایرانی فوج اور پاسداران کے پانچ کمانڈ‘ تیرہ فوجی اڈے اور قریباً ایک لاکھ نفری موجود ہے۔ یہ پانچ کمانڈ دمشق کے بیس میں واقع ایرانی ہیڈ کوارٹر سے براہِ راست منسلک ہیں‘ بلکہ التنف میں جو شام‘ اردن اور عراق کا انتہائی اہم سرحدی علاقہ ہے‘ امریکی اڈے کے گرد حزب اللہ کی پیش قدمی عروج پر ہے۔

شام سے امریکی فوجی انخلاء کا بیان سامنے آتے ہی اسرائیل میں جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ تازہ ترین رپورٹ کے مطابق اسرائیلی اخبار ’’یدی ہوتھ اخرونوتھ‘‘ کے مطابق ایک اسرائیلی عہدیدار کا کہنا ہے کہ امریکا کی طرف سے اس قسم کا بیان ہمارے لیے تعجب سے کم نہیں بلکہ افسوس ناک ہے۔ ہمیں اس بیان سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور ہم شام میں ایرانی فوج کی موجودگی کے خلاف سخت اقدامات جاری رکھیں گے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ امریکا کو بیچ میں سے نکال کر اسرائیل براہ راست گریٹر اسرائیل کے منصوبے کی طرف پیش قدمی کرنا چاہتا ہے؟ یہ محض اتفاق نہیں‘ بلکہ صدر ٹرمپ نے جس وقت امریکی سفارت خانے کو یروشلم منتقل کرنے کا اعلان کیا تھا‘ اُمتِ مُسلمہ کے دانشوران اس بات کو سمجھ گئے تھے کہ اب طاقت کا توازن امریکا سے اسرائیل کی طرف منتقل ہونے والا ہے اور اسرائیل اقتدار میں آنے سے قبل امریکی افواج کو دنیا بھر سے واپس بلانے اور اخراجات کم کرنے کے عزائم کی طے شدہ منصوبے کی تکمیل کر رہا ہے‘ جہاں پُرامن‘ محفوظ اور لاتعلق نیا امریکا دنیا کی سربراہی سے دستبردار ہو جائے گا اور دنیا پر گریٹر اسرائیل کی عملاً حکمرانی ہوگی۔ ❁❁❁

اصلی اور فرعی مسائل میں
مخالفین کے ساتھ برتاؤ کرنے کے
فقہی ضابطے (۵)

تالیف: ڈاکٹر احمد بن سعد الغامدیؒ (م۱۴۳۴ھ)

ترجمہ: ڈاکٹر صہیب حسن☆

ضابطہ نمبر ۱۴:

مخالف کا احترام کرنا اور اس میں کیڑے نہ نکالنا

شرعی علم سے متعلق عصر محقق دینی مسائل میں اپنے اپنے فہم کا ذمہ دار ہے اور اپنی فہم اور اپنے یقین کے مطابق عبادت کے عمل میں بھی مصروف ہے۔ اور اگر ایک طالب علم کسی نص کے فہم یا کسی مسئلہ کے حکم کے بارے میں اپنے ہی جیسے طالب علم بھائی سے اختلاف کر لے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان دونوں میں سے ایک گنہگار ہے‘ جو اس بات کا مستحق ہے کہ اسے سزا دی جائے‘ یا اسے چھوڑ دیا جائے‘ یا اس کی قدر و منزلت میں کمی کی جائے‘ یا اس پر تہمت لگائی جائے کہ وہ جان بوجھ کر حق کی مخالفت کر رہا ہے‘ یا ایسی ہی کوئی اور بات اس کے بارے میں کہی جائے‘ اور صرف اس لیے کہ اس نے فہم مسئلہ میں یا اس پر حکم لگانے میں مخالفت کی ہے‘ اس سے حقارت کا سلوک کیا جائے‘ کیونکہ اس کا اپنا فہم اور حکم لگانا‘ چاہے وہ خود مجتہد ہو یا مقلّد‘ مخالف کے فہم اور اجتہاد سے زیادہ بہتر نہیں ہے۔ اور اس لیے دونوں کو ایک دوسرے کا احترام کرنا

☆ سیکریٹری‘ اسلامک شریعہ کونسل‘ لندن (برطانیہ)

چاہیے‘ دونوں ہی حق کے متلاشی ہیں‘ اور بہتر ہے کہ وہ ادب کے ساتھ ایک دوسرے سے بات چیت کریں تاکہ حق تک پہنچ سکیں‘ اور انہیں چاہیے کہ وہ ایک دوسرے پر کیچڑ نہ اچھالیں اور نہ ہی غیر مہذّب الفاظ استعمال کریں۔ چند الفاظ ایسے ہیں جن میں تحقیر اور تنقیص کا شائبہ پایا جاتا ہے‘ کسی بھی طالب علم کے لیے انہیں اپنے مخالفین کے حق میں استعمال کرنے سے گریز کرنا چاہیے‘ جیسے یہ کہنا کہ فلاں بدعتی ہے‘ یا حد سے بڑھا ہوا ہے‘ یا کٹ حجتی ہے‘ یا تساہل پسند ہے‘ یا سطحی علم رکھتا ہے‘ یا انتہائی سادہ ہے‘ یا غفلت کا شکار ہے‘ یا کند ذہن ہے‘ یا جاہل ہے‘ اور ایسے ہی دوسرے غیر مؤدب الفاظ۔

ایسے الفاظ لوگوں کے دلوں میں نفرت کا بیج بوتے ہیں اور یوں حق قبول کرنے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ ابن امیر الحاج فرماتے ہیں:

’’اگر لوگوں میں نفرت سما جائے تو دل اندھے ہو جاتے ہیں‘ خیالات ماند پڑ جاتے ہیں اور خیر کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔‘‘(۱)

امام شاطبی کہتے ہیں:

’’امام غزالی نے اپنی کسی کتاب میں لکھا ہے کہ عوام کے دلوں میں جہالت اس لیے غالب ہے کہ اہلِ حق اپنی جہالت کی بنا پر حق کو چیلنج کے انداز میں پیش کرتے ہیں اور اپنے کمزور مخالفین کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں‘ جس سے ان کے دلوں میں بھی دشمنی اور مخالفت زور پکڑ لیتی ہے‘ انہیں اپنا باطل عقیدہ اور زیادہ عزیز ہو جاتا ہے‘ اور پھر خیر اندیش علماء بھی اس فساد کے ظاہر ہو جانے کے بعد اسے مٹانے پر قدرت نہیں رکھ پاتے۔‘‘

پھر شاطبی ارشاد فرماتے ہیں:

’’جو کچھ انہوں نے کہا وہ بالکل درست ہے‘ اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس پر شاہد ہے۔‘‘(۲)

امام غزالی اپنی مایہ ناز کتاب ’’احیاء علوم الدین‘‘ میں ارشاد فرماتے ہیں:

’’اگر وہ اپنے تعصب پر اکڑ جاتے ہیں تو پھر ان سے کوئی امید نہیں رکھی جا سکتی‘ کیونکہ تعصب کی بنا پر نفس میں عقیدہ راسخ ہو جاتا ہے۔ علماء سوء کی بُری عادتوں میں سے یہ ایک عادت ہے کہ وہ حق کی خاطر تعصب رکھنے میں مبالغہ کرتے ہیں اور مخالفین کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔‘‘

اور پھر وہ ارشاد فرماتے ہیں:

’’اور ایسا کرنے سے باطل کے مددگار بھی زور پکڑ لیتے ہیں اور جو بات ان کی طرف

منسوب کی جارہی ہے وہ اس پر سختی سے چمٹ جاتے ہیں' حالانکہ اگر وہ بجائے تعصب یا تحقیری انداز کے' نرمی اور شفقت سے کام لیتے اور تنہائی میں مخالف سے بات کرتے تو یقیناً کامیابی سے ہمکنار ہوتے۔''

اپنے اس طرزِ عمل کو وہ دین کے دفاع کا نام دیتے ہیں اور یہ کہ وہ مسلمانوں کی بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں' حالانکہ ایسا کرنے میں یقینی طور پر مخلوقِ خدا کی ہلاکت ہے اور لوگوں کے دلوں میں بدعت کو اور زیادہ مضبوط کرنا ہے۔''(۳)

علماء کے ان حوالوں سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ بدزبانی اور تحقیری انداز مخالف کو حق قبول کرنے سے روکتا ہے بلکہ اسے دشمن بنا دیتا ہے' اور یہ کہ بات اگر حق بھی ہو لیکن اس پر حد سے زیادہ تعصب کا اظہار کرنا مخالف کی ایک طرح سے توہین ہے کہ جس کی بنا پر وہ اپنے باطل عقائد پر اور زیادہ ڈٹ جاتا ہے۔ یعنی اہل حق کا حق کے اظہار کے لیے غلط راستہ اختیار کرنا مخالف کو حق اور اہلِ حق سے نفرت کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔

حواشی

(۱) التقریر والتحبیر ۱۱۹:۶۔ (۲) الموافقات ۲۶۵:٤

(۳) احیاء علوم الدین ۱٤۱:۱

ضابطہ نمبر ۱۵:

کسی کے بارے میں حکم نہ لگانا مگر مکمل استقراء کے بعد

اگر کسی کے بارے میں اندازہ لگانا ہو یا اس پر حکم لگانا ہو تو سب سے پہلے اُس کے تمام اقوال اور عقائد کا جائزہ لینا چاہیے۔ دیکھنا چاہیے کہ مختلف مسائل میں ان کا موقف کیا رہا ہے' ان کی اپنی تحریریں اور آثار کیا کہتے ہیں۔ مخالفین یا ان کی باتوں کو نقل کرنے والوں کے اقوال کی روشنی میں نہیں' کہ یہ قرین انصاف نہیں۔ جو شخص کسی پر حکم لگاتا ہے وہ قاضی کے منصب پر فائز ہے اور قضاء کا تقاضا ہے کہ جس پر حکم لگایا جا رہا ہے یا جو اس کی نیابت کر رہا ہے' اُس کے دلائل اور موقف کو سنا جائے' اس لیے مخالفین پر حکم لگانے سے پہلے یا تو بلاواسطہ ان کی بات کو سنا جائے یا ان چیزوں کو جو اس کی نیابت کرتی ہیں' جیسے اس شخص کی تالیفات یا اس کی ریکارڈ شدہ

تقاریر یا اس کے ٹیپ۔ یہی عین عدل ہے جس کا ہمیں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے:

﴿وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ١٥٢﴾ (الانعام)

''جب تم کوئی بات کہو تو انصاف کرو چاہے وہ قرابت دار ہی کیوں نہ ہو' اور اللہ کے عہد کو پورا کرو' یہ ہے وہ بات کہ جس کی اللہ نے تمہیں وصیت کی ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کر سکو۔''

اور پھر یہ بات بھی ضروری ہے کہ جو کچھ اس کے حق میں یا اس کے خلاف کہا گیا ہے' دونوں باتوں کا ذکر کیا جائے' صرف غلطیوں کو چُن چُن کر ذکر نہ کیا جائے۔ ایسا کرنا ظلم ہے جس سے اللہ تعالیٰ راضی نہ ہوں گے۔ آخرت میں نیکی اور بدی دونوں پیش کی جائیں گی اور جس کا پلہ بھاری ہوگا اس کے مطابق حکم لگایا جائے گا۔

ایک اور بات بھی ضروری ہے کہ مخالف کے طریق کار' اس کے اسلوب اور کتابوں' خطبات اور تقاریر میں اس کے الفاظ کا انتخاب جانا جائے۔ یہ عین ممکن ہے کہ وہ جو بات کر رہا ہو' بظاہر اس سے مخالفت کی بو آتی ہو لیکن اس کی کتابوں یا اس کے کلام کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہو کہ اس کا اصل مطلب کیا تھا اور یہ کہ مخالفت کرنا اس کا مقصود نہ تھا۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ارشاد فرماتے ہیں:

''ایک سب سے بڑی کوتاہی یہ ہے کہ متکلم کی طرف غلطی منسوب کی جائے' حالانکہ اس بات کا قوی امکان تھا کہ اس کی بات کو درست طریقے پر سمجھا جائے اور اس کے اسلوبِ کلام کی احسن طریقے سے تعبیر کی جائے' اور اس طرح دو مختلف جگہوں پر اس کی کہی گئی باتوں کو غلطی کی طرف منسوب کرنے سے بچا جائے۔''(۱)

شیخ الاسلام ایک دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

''علماء کے مذاہب کو مطلق طریقے سے سمجھنا اور ان کے اپنے اصولوں اور ضابطوں اور ان کی اپنی تشریح کو نظر انداز کرنا' نہایت قبیح رائے قائم کرنے کی طرف لے جاتا ہے۔''(۲)

اور یہ بھی فرمایا:

''متکلم کے کلام کی وہی تفسیر کی جائے جو اس کے اپنے کلام ہی سے سمجھ میں آتی ہے اور اس مقصد کے لیے یہاں وہاں ہر جگہ اس کے کلام کا مطالعہ کیا جائے' معلوم کیا جائے کہ کسی خاص لفظ کے استعمال سے وہ کیا مطلب لیتا ہے۔ ہو سکتا ہے ایک جگہ اس نے

ایک بات کہی ہو اور دوسری جگہ اس کا منشا اور مقصد بیان کیا ہو' اور یوں اگر الفاظ و معانی کے بیان میں اس کی عادت اور عرف کی پہچان ہو جائے تو پھر اس کے اصل مقصود کو جاننے میں مدد مل سکتی ہے۔

اگر وہ کسی لفظ کو ان معنوں میں استعمال کرے جو وہ عادتاً نہیں کرتا رہا ہے اور اس لفظ کے استعمال کے وقت اپنی عادت کو ترک کر دے اور پھر اس بنا پر کہ جو وہ اس لفظ کا معنی لیا کرتا ہے' یہاں اس کا الٹ مراد ہے اور یوں اس کے کلام میں تناقض دکھایا جائے' پھر بھی یہ مناسب نہیں کہ اس کے کلام کے سیاق و سباق کو چھوڑ کر کوئی ایسا معنی مراد لیا جائے جو اس کی ساری تحریروں کے موافق نہ بنتا ہو' اور اگر ایسا کیا گیا تو یہ اس کے کلام کی تحریف کے مترادف ہوگا' اس کے منشا و مراد میں تبدیلی کا باعث ہوگا' بلکہ اس پر افترا پردازی شمار ہوگا۔''(۳)

مندرجہ بالا اقتباسات امام ابن تیمیہؒ کے اس منہج کا بیان ہوا ہے کہ مخالفین کے اقوال کو کیسے تنقید کی میزان میں تولا جائے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) اگر کسی کلام سے دونوں مطلب یعنی صحیح اور غلط لیے جا سکتے ہوں تو اس کا صحیح مطلب ہی لیا جانا چاہیے۔ جو ایسا نہ کرے وہ خود غلطی پر ہے۔

(۲) اگر کلام مطلق ہو یا مجمل ہو تو مصنف ہی کے کسی دوسرے مقام سے اس کی تفسیر و تشریح تلاش کی جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو مصنف کی طرف ایسی قبیح باتیں منسوب کی جا سکتی ہیں کہ جن کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔

(۳) اگر مصنف کا کوئی ایسا کلام ملے جو اس کے باقی کلام سے مختلف نظر آتا ہو تو کوشش یہ ہونی چاہیے کہ دونوں کا ایسا مطلب نکالا جائے جس سے دونوں باتوں میں توفیق کی شکل نکل آئے نہ کہ تناقض کی۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو یہ اس کے کلام کی تحریف شمار ہوگا' اس کے کلام سے ایسا مطلب نکالنے کا موجب ہوگا جو مصنف کا مقصد و منشا نہ تھا' بلکہ اس پر جھوٹ باندھنے کے مترادف ہوگا۔

(۴) اس جلیل القدر عالم کی جانب سے یہ انتہائی عمدہ قاعدہ بتایا گیا ہے۔ یہ وہ عالم ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دکھائی گئی روشنی میں ہر بات کی حقیقت کو دیکھ سکتے ہیں اور پھر ان کے قلم اور ان کی زبان پر وہ نورانی قواعد جاری ہوتے ہیں جو طالبین حقیقت کے لیے مشعلِ راہ بن جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے نوازیں اور جنات نعیم میں ان کے درجوں کو بلند فرمائیں۔

حواشی

(۱) مجموع الفتاویٰ ۱۱۴:۳۱ (۲) الصارم المسلول علی شاتم الرسول ص ۲۸۷۔
(۳) الجواب الصحیح ۲۸۸:۲

ضابطہ نمبر ۱۶:

واسطہ قول سے ہونا چاہیے نہ کہ قائل سے

اگر ہم کسی خاص قول یا مذہب پر حکم لگانا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے اس مقصد سے تجاوز کر کے قائل کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے' تاکہ کہیں قائل کی وجہ سے ہمارے نکتہ نظر میں ایجابی یا سلبی طور پر کوئی اثر واقع نہ ہو۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ قائل کا شمار اچھے لوگوں میں ہوتا ہے' اور پھر وہ ایک غلط بات کہتا ہے کہ جس کی تفسیر یا تشریح اس کے کسی دوسرے قول سے ممکن نہیں ہوتی' اور یوں اس قائل کی قدر و منزلت کی بنا پر ہم اس کی غلطی سے صرفِ نظر کریں یا اس کی غلطی کو جائز ٹھہرانے کی کوشش کریں' اور ایسا کرنے میں ہم جس نتیجے پر پہنچیں گے وہ درست نہ ہوگا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ قائل ہمارے مخالفین میں سے ہو' ہماری نظر میں بدعتی ہو' لیکن بات صحیح کہتا ہو' تو ہم پھر بھی اس کی درست بات کو قبول کرنے سے کترائیں۔ اس لیے ہمیں یہ کہنے میں باک نہیں کہ درست علمی تنقید مذکورہ قاعدے کی روشنی ہی میں کی جا سکتی ہے۔ قرآن کریم سے اس قاعدے کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ سورۃ النمل میں ملکہ سبا کا یہ قول ذکر کیا گیا:

﴿قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ﴾

''اس نے کہا کہ بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو وہاں فساد برپا کرتے ہیں اور اس بستی کے معزز افراد کی تذلیل کرتے ہیں۔''

اور پھر اللہ تعالیٰ اس کی بات کی تصدیق یوں فرماتے ہیں:

﴿وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۝۳۴﴾ (النمل) ''ہاں وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔''

ابنِ جریر طبری نے ان آیات کی تفسیر میں رقم کیا ہے:

''ملکہ سبا کا اپنے درباریوں سے خطاب کرتے ہوئے یہ کہنا' جب کہ وہ اس کا حکم آ جانے پر سلیمان علیہ السلام سے جنگ کرنے پر آمادگی کا اظہار کر رہے تھے کہ 'جب بادشاہ کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں' یعنی بزور طاقت ''تو وہاں فساد برپا کرتے ہیں'' یعنی اسے ویران کر دیتے ہیں ''اور پھر وہاں کے معززین کو ذلیل ورسوا کر دیتے ہیں'' یعنی آزاد لوگوں کو غلام بنا لیتے ہیں۔ یہاں تک اس کا کلام تھا اور پھر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''اور وہ ایسا ہی کرتے ہیں'' یعنی اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جیسے ملکہ سبا نے کہا' بادشاہ جب کسی بستی کو بزور طاقت فتح کرتے ہیں تو ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔''(۱)

شیخ محمد الامین الشنقیطی اپنی تفسیر ''اضواء البیان'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''اگر کوئی بات دلیل کی بنا پر راجح نظر آئے تو ہم اسے بھی راجح قرار دیں گے اور اس میں کسی خاص مذہب یا کسی خاص شخصیت کا تعصب حائل نہیں ہوگا' کیونکہ ہم قول کی طرف دیکھتے ہیں نہ کہ اس کے قائل کی طرف۔ ہر کلام میں کچھ نہ کچھ ایسا ہوتا ہے جو قابلِ قبول ہو یا قابلِ رد ہو' سوائے نبی ﷺ کے قول کے' اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ حق' حق ہی ہے چاہے اس کا قائل حقیر کیوں نہ ہو۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ملکہ سبا حالانکہ وہ اور اس کی قوم اللہ کو چھوڑ کر سورج کی عبادت کیا کرتے تھے لیکن جب اس نے ایک سچی بات کہی تو اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق کی اور اس تصدیق میں اس کا کفر مانع نہیں ہوا۔''(۲)

امام شوکانی کہتے ہیں:

''مجتہد وہ ہے جو یہ نہیں دیکھتا کہ قائل کون ہے؟ بلکہ صرف قول کی طرف دیکھتا ہے' اور اگر وہ اقلیت کو چھوڑ کر اکثریت کی صرف اس لیے پیروی کرے کہ وہ کسی جلیل القدر صاحبِ علم اور صاحبِ حیثیت شخص کی متابعت کر رہے ہیں تو اسے جان لینا چاہیے کہ ابھی اس کی رگوں میں کچھ عصبیت باقی ہے اور اس میں تقلید کا بھی شائبہ پایا جاتا ہے اور یہ کہ وہ اجتہاد کا حق ادا نہیں کر رہا ہے۔''(۳)

امام ابن القیم نے جب ابی اسماعیل الہروی کی کتاب 'منازل السائرین بین ایاک نعبد وایاک نستعین'' کی شرح بیان کی تو انہوں نے دیکھا کہ بعض مقامات پر الہروی نے لغزش کھائی ہے جس کی تاویل ممکن نہیں۔ الہروی وہ شخص ہیں جو توحید صفات میں سلف کے مذہب کے قائل ہیں اور نیکی کا حکم دینے میں اور بدی سے روکنے میں انہوں نے قابلِ تعریف اقدام کیے ہیں' لیکن جب وہ جادۂ حق سے اتر گئے تو امام ابن القیم یہ کہنے پر مجبور ہوئے:

''شیخ الاسلام ہمارے حبیب ہیں' لیکن ہمیں حق ان سے زیادہ عزیز ہے اور شیخ الاسلام

ابن تیمیہ کہا کرتے تھے: ان کا عمل ان کے علم سے زیادہ بہتر ہے' اور انہوں نے بالکل سچ کہا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور بدعتیوں سے جہاد کرنے میں وہ بہت سرگرم رہے ہیں' اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نصرت میں انہوں نے جو موقف اختیار کیا وہ کسی سے مخفی نہیں' لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ گوارا نہ تھا کہ عصمت کی چادر سوائے اس صادق و مصدوق (ﷺ) کے جو کبھی اپنی خواہش کی بنا پر بات نہیں کرتا' کسی اور پر بھی چڑھائی جائے۔ الہروی نے اس باب میں الفاظ اور معنی دونوں اعتبار سے غلطی کی ہے۔''(۴)

اور پھر وہ ان کی غلطیوں کی نشاندہی کرنے لگتے ہیں۔

حواشی

(۱) تفسیر طبری ۱۹:٤٥٤۔
(۲) أضواء البيان ۱:٦۔
(۳) أدب الطلب: ٤٣۔
(٤) مدارج السالكين ۳:۳۹٤۔

ضابطہ نمبر ۱۷:

انسان کے ذاتی فہم کو شرع کے درجہ میں نہ سمجھنا

یہ بات قطعاً جائز نہیں کہ کسی بھی بشر کے فہم کو اصل دین کا درجہ دے دیا جائے کہ جس پر دوستی اور دشمنی کا انحصار ہو۔ شریعت کے نصوص سمجھنے میں اس سے مدد لی جا سکتی ہے لیکن اس اعتقاد کے ساتھ کہ یہ اللہ یا اس کے رسول ﷺ کا حکم نہیں ہے۔

ایک آدمی کے علم' عقل' اخلاص اور طریق کار کی درستگی کے لحاظ سے لوگوں کی سمجھ میں اختلاف واقع ہوتا ہے' پھر بھی وہ بشری فہم کے دائرے میں رہے گا' لوگوں کے لیے وہ لازم قرار نہیں دیا جا سکتا اور نہ ہی اس کی بنا پر دوستی اور دشمنی کا معیار بنایا جا سکتا ہے۔ دینی مسائل دو طرح کے ہیں:

ایک قسم وہ کہ جہاں صراحت کے ساتھ نصوص موجود ہوں' اور چونکہ نص موجود ہے اس لیے اس کا اتباع کرنا واجب ہوگا' اور ایک قسم وہ جس میں نص وارد نہیں ہوئی لیکن ایک عالم نے اس کی تفسیر بیان کی ہے اور ہوسکتا ہے کہ کسی دوسرے عالم نے اس کی دوسری تفسیر بیان کی ہو'

ایسی رائے کا اتباع لازم نہیں ہے‘ صرف عالم کے فہم سے مدد لی جاسکتی ہے۔ شیخ الاسلام رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں:

’’فصل: اقوال دو طرح کے ہیں‘ انبیاء کے ثابت شدہ اقوال جو کہ غلطی سے مبرا شمار ہوتے ہیں‘ ان کے معنی ومطالب کا حق ہونا واضح ہے‘ پہچاننے والے انہیں پہچانتے ہیں اور جاہل ان سے ناواقف رہتے ہیں۔ یہاں مطلوب یہ ہے کہ انبیاء نے ان اقوال سے کیا مراد لیا تھا۔ تو جو شخص وہ راستہ اختیار کرتا ہے جس سے ان کی مراد پتہ چل سکے تو وہ ہدایت کے راستہ پر ہے‘ لیکن جس کا ارادہ یہ ہو کہ ان کا قول اس کی اپنی خواہش کے تابع ہو جائے‘ یعنی اگر اس کے موافق ہو تو قبول کرے وگرنہ رد کر دے اور پھر تاویل کے نام سے ان کے قول کی تحریف کرے‘ حالانکہ وہ بخوبی جانتا ہے کہ جو تاویل وہ کر رہا ہے اس کا اکثر و بیشتر حصہ انبیاء کا مقصد نہیں رہا ہے‘ تو ایسا شخص کلام میں تحریف کا مرتکب ہو رہا ہے‘ اور اس تاویل کا طلب گار نہیں ہے جسے راسخین فی العلم جانتے اور پہچانتے ہیں۔

دوسری قسم وہ اقوال جو انبیاء سے منقول نہیں ہیں۔ انبیاء کے علاوہ دوسرے لوگ معصوم نہیں ہیں۔ ان کا کلام اسی وقت قبول کیا جائے گا جب ان کا مطلب ومنشا واضح ہو جائے گا اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ان میں کتنی خوبی ہے اور کتنی برائی ہے۔‘‘(۱)

ایک اور جگہ پر تفصیلاً ذکر کرتے ہوئے کہا کہ لوگوں کے عرف کے مطابق شرع کے تین مطلب ہیں:

وہ شرع جو نازل ہوئی ہے۔ وہ شرع جس کی تاویل کی گئی ہے۔
وہ شرع جس میں تبدیلی کی گئی ہے۔

جہاں تک اللہ کی طرف سے نازل کی گئی شریعت کا تعلق ہے تو وہ کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ ہے۔ یہ وہ شریعت ہے جو پہلے اور بعد میں آنے والے تمام لوگوں پر واجب ہے۔ اللہ کا افضل ترین ولی وہی ہوگا جو کامل طریقے سے اس کی پیروی کرے گا۔ جو اس شریعت کی پابندی نہیں کرتا یا اس میں کیڑے نکالتا ہے یا اس سے خروج کو جائز سمجھتا ہے‘ اسے توبہ کی تلقین کی جائے گی‘ اگر وہ توبہ کر لیتا ہے تو ٹھیک ہے‘ ورنہ وہ واجب القتل ہے۔

اور وہ شریعت جس کی تاویل کی گئی ہے تو اس سے مراد علماء کے اجتہادی مسائل میں ان کی آراء ہیں۔ اگر کوئی ان آراء میں کسی امام کی تقلید کر لیتا ہے تو وہ اس کے لیے جائز ہے‘ لیکن کسی ایک امام کے قول کو پکڑ لینا واجب نہیں ہے۔

اور وہ شریعت جو تبدیل شدہ ہے تو اس سے مراد ہیں بناوٹی احادیث‘ الٹی تفسیرات‘ گمراہ کن بدعات جو شریعت میں داخل کر دی گئی ہیں‘ حالانکہ ان کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اسی طرح اس میں **الحکم بغیر ما انزل اللہ** یعنی ایسے فیصلے کرنا جو اللہ کی نازل کردہ شریعت سے مطابقت نہ رکھتے ہوں‘ بھی داخل ہیں‘ اور کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ ان جیسی چیزوں کی اتباع کرے۔‘‘(۲)

ابن القیمؒ ارشاد فرماتے ہیں:

’’وہ حکم جو نازل شدہ ہے اور واجب الاتباع ہے اور وہ حکم جس کی تاویل یا تفسیر کی گئی ہے جس کی اتباع زیادہ سے زیادہ جائز کہی جاسکتی ہے‘ دونوں میں یہ فرق ہے کہ پہلی قسم میں وہ چیزیں داخل ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ پر اتاری ہیں اور جن کے مطابق انہوں نے لوگوں میں فیصلے کیے ہیں‘ اور یہ وہ احکام ہیں کہ ان کے علاوہ اور کسی کا اعتبار نہیں۔ اس کے مقابلے میں وہ حکم جس کی تاویل کی گئی ہے تو اس سے مراد مجتہدین کے مختلف اقوال ہیں جن کی اتباع واجب نہیں‘ جو ان کی مخالفت کرے اسے کافر یا فاسق قرار نہیں دیا جاسکتا‘ کیونکہ ان اقوال کے حاملین خود کہتے ہیں کہ یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم نہیں‘ بلکہ یہ ہماری آراء پر مبنی اجتہادات ہیں‘ تو جو چاہے انہیں قبول کرے۔ اور تبدیل شدہ حکم سے مراد ہر وہ چیز ہے جسے اللہ نے نہیں اتارا۔ تو ایسی چیز کا نافذ کرنا‘ اس پر عمل کرنا یا اس کی پیروی کرنا بالکل جائز نہیں۔ اور ایسا کرنے والا کفر‘ فسق یا ظلم‘ ان تینوں درجوں میں سے کسی ایک درجے پر ہوگا۔‘‘(۳)

مندرجہ بالا تقسیم سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ تمام دینی مسائل اس نوعیت کے نہیں ہیں کہ ان کی بنا پر دوستی یا دشمنی رکھی جائے۔ دوستی یا ’’ولاء‘‘ کا معیار صرف وہ مسائل ہیں جو قطعی دلائل سے ثابت ہوں۔ رہے وہ مسائل جن میں علماء نے نصوص سے استنباط کرتے ہوئے اجتہاد کیا ہے تو وہ سارے کے سارے اجتہادی مسائل ہیں‘ جن میں کچھ درست بھی ہو سکتے ہیں اور کچھ غلط بھی‘ اور اسی لیے ان میں مخالفین کی غلطیوں سے چشم پوشی کی جاسکتی ہے۔

حواشی

(۱) مجموع الفتاویٰ‘ ۴:۱۹۱۔ (۲) الفتاویٰ‘ ۱۱:۵۰۷
(۳) حاوی الأرواح‘ ص ۲۶۶۔

ضابطہ نمبر ۱۸:

دِینی مسائل کو بشری طبیعت کا لبادہ نہ اُڑھانا

لوگوں کے مزاج اشخاص اور علاقوں کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں۔ لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو جلدی سے اثر قبول کر لیتے ہیں اور مزاج کے تیز ہوتے ہیں‘ کچھ اس کے الٹ ہوتے ہیں یعنی اثر جلدی سے قبول نہیں کرتے اور مزاج کے ٹھنڈے ہوتے ہیں۔

پہلی قسم کے لوگ اپنی افتادِ طبع کے مطابق مخالفین کے ساتھ سختی سے پیش آنے کے قائل ہیں اور اسے دین کا رنگ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ یہ مسئلہ دین میں ولاء و براء (یعنی دوستی یا قطع تعلق) کا مسئلہ ہے اور پھر وہ اپنے اس موقف کے لیے شریعت سے دلیل بھی ڈھونڈنا شروع کر دیتے ہیں۔ حقیقت میں یہ موقف شریعت پر مبنی نہیں ہے‘ بلکہ یہ ایک بشری تقاضے کو شریعت کا نام دینے کا مسئلہ ہے۔

اس کے مقابلے میں دوسری طبع کے لوگ اپنی افتادِ طبع کے مطابق اللہ تعالیٰ کی حرمتوں کو پامال ہوتے دیکھتے ہیں‘ خود شریعت میں کانٹ چھانٹ ہوتے ملاحظہ کرتے ہیں‘ لیکن وہ حکمت اور سوچ بچار کے بہانے دین کی نصرت سے کتراتے جاتے ہیں‘ یہاں تک کہ دین کے نشانات مٹنے شروع ہو جاتے ہیں اور پھر یہ لوگ بھی اپنے موقف کی تائید کے لیے شرعی دلائل کا سہارا لیتے ہیں۔

لیکن حقیقی شریعت ان دونوں مواقف کے درمیان ہے۔ ایک مسلمان اپنے اعمال اور تصرفات کو دین کے ضابطوں سے جکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ جہاں دین آگے بڑھنے کے لیے کہتا ہے وہ آگے بڑھتا ہے‘ جہاں رکنے کے لیے کہتا ہے وہ رک جاتا ہے‘ جہاں غصے کے اظہار پر ابھارتا ہے وہاں وہ غصہ دکھاتا ہے‘ جہاں وہ شیر وشکر ہو جانے کا اشارہ کرتا ہے وہاں سپر ڈال دیتا ہے‘ جہاں سختی کا مطالبہ کرتا ہے وہاں سخت ہو جاتا ہے اور جہاں نرمی کا تقاضا کرتا ہے وہاں نرم پڑ جاتا ہے۔ میدانِ جنگ میں کفار اور منافقین کے مقابلے میں سختی کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ جَاہِدِ الۡکُفَّارَ وَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ وَ اغۡلُظۡ عَلَیۡہِمۡ ؕ وَ مَاۡوٰىہُمۡ جَہَنَّمُ ؕ وَ بِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ ﴿۷۳﴾﴾ (التوبۃ)

’’اے نبی (ﷺ)! کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان سے سختی سے پیش آؤ۔ ان کا

ٹھکانہ جہنم ہے‘ اور کیا ہی برا یہ انجام ہے!‘‘

اس کے مقابلے میں مؤمنوں سے نرمی کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ مَعَہٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ تَرٰىہُمۡ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنَ اللّٰہِ وَ رِضۡوَانًا ۫ سِیۡمَاہُمۡ فِیۡ وُجُوۡہِہِمۡ مِّنۡ اَثَرِ السُّجُوۡدِ ؕ ذٰلِکَ مَثَلُہُمۡ فِی التَّوۡرٰىۃِ ۚ وَ مَثَلُہُمۡ فِی الۡاِنۡجِیۡلِ ۚ کَزَرۡعٍ اَخۡرَجَ شَطۡـَٔہٗ فَاٰزَرَہٗ فَاسۡتَغۡلَظَ فَاسۡتَوٰی عَلٰی سُوۡقِہٖ یُعۡجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیۡظَ بِہِمُ الۡکُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنۡہُمۡ مَّغۡفِرَۃً وَّ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ﴿۲۹﴾﴾ (الفتح)

’’محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں‘ اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں پر سخت ہیں‘ آپس میں رحم دل ہیں‘ تم انہیں دیکھو گے کہ رکوع اور سجدے کر رہے ہیں‘ اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضامندی کی جستجو میں ہیں‘ ان کا نشان اُن کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے ہے۔ ان کی یہی مثال تورات میں ہے‘ اور ان کی مثال انجیل میں ہے۔ اس کھیتی کی مانند جس نے اپنا انکھوا نکالا‘ پھر اسے مضبوط کیا اور وہ موٹا ہو گیا‘ پھر اپنے تنے پر سیدھا کھڑا ہو گیا اور کسانوں کو خوش کرنے لگا تاکہ ان کی وجہ سے کافروں کو غصہ دلائے۔ ان ایمان والوں اور نیک اعمال والوں سے اللہ نے بخشش کا اور بہت بڑے ثواب کا وعدہ کیا ہے۔‘‘

امام ابن تیمیہؒ اس قسم کے لوگوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

’’لوگوں میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے اخلاق کے لحاظ سے بہت نرم‘ بہت شفیق اور بہت محبت کرنے والے ہوتے ہیں اور ان صفات کی بنا پر اللہ‘ اس کے رسول اور اہل ایمان سے محبت کرتے ہیں‘ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں‘ اپنے مال سے دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں‘ لیکن اپنی نرم خوئی کی بنا پر فحش کاموں سے بھی لگاؤ رکھتے ہیں اور ان پر اپنا مال بھی خرچ کرتے ہیں‘ تو تم دیکھو گے کہ وہ حق اور باطل دونوں سے محبت رکھتے ہیں‘ دونوں کو اچھا سمجھتے ہیں اور دونوں کی مدد کرتے ہیں۔ اور اس کے برعکس کچھ لوگوں میں سختی پائی جاتی ہے اور اس بنا پر وہ فحش باتوں سے اجتناب کرتے ہیں اور ان سے نفرت رکھتے ہیں‘ اور اسی طرح وہ لوگوں کو نفع پہنچانے‘ ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے اور ان کی غلطیوں کو معاف کرنے سے بھی دور رہتے ہیں۔ گویا یہ لوگ حق اور باطل دونوں ہی سے بغض و نفرت رکھتے ہیں‘ دونوں ہی کو جھٹلاتے ہیں‘

اور دونوں کی مدد کے روادار نہیں ہیں‘ بلکہ دونوں کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں۔‘‘(۱)

چنانچہ پہلی قسم کے لوگ اپنی نرم خوئی اور شفقت کی بنا پر اس معیار یا میزان سے محروم ہو گئے کہ جس سے حق اور باطل‘ خیر اور شر میں تمیز کی جا سکے‘ اور اپنی اس نرم روی کی وجہ سے دونوں کو ہی قبول کرتے نظر آتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہی اچھے اخلاق کی نشانی ہے۔ ایسے لوگ بعض دفعہ باطل کی تعریف کرتے بھی نظر آئیں گے اور اس کی امداد بھی۔ تو جو شخص ان کا ہم نوا ہوتا ہے وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ غلط ہیں‘ ان کی غلطی سے چشم پوشی کرتا ہے۔

رہے دوسری قسم کے لوگ تو وہ اپنی سختی اور اپنی طبعی قساوت کی بنا پر تمام لوگوں سے سختی سے پیش آتے ہیں‘ چاہے وہ نیک ہوں یا بد۔ نیک شخص کا احترام نہیں کرتے اور گنہگار پر رحم نہیں کرتے‘ اگر کوئی ان کی مخالفت کرے تو وہ اسے ایذا پہنچائیں گے اور سمجھیں گے کہ وہ اس طرح اللہ کا قرب حاصل کر رہے ہیں۔ اس لیے شرعی احکام کو بشری طبائع سے خلط ملط کرنا‘ خاص طور پر مخالف سے بات کرتے وقت یا اسے نصیحت کرتے وقت‘ بالکل درست نہیں ہے۔

حاشیہ

(۱) قاعدة فی المحبة‘ ۱:۱۳۵۔

ضابطہ نمبر ۱۹:

علماء کے اقوال پر تعصّب نہ رکھنا

بہت سارے احکام میں علماء کے متعدد قول ملتے ہیں‘ اور جس کی وجہ یہ ہے کہ فہم میں اختلاف پایا جاتا ہے‘ استنباط کے وسائل میں تنوع ہے‘ ہر دلیل کو مختلف انداز میں سمجھا جاتا ہے۔ نتیجتاً نہ صرف فتاویٰ میں تنوع پایا جاتا ہے بلکہ کبھی کبھی ان میں سخت اختلاف بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اور پھر ہر عالم کے اپنے ماننے والے ہیں جو اس کے فہم اور استنباط پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

فتاویٰ میں یہ تنوّع‘ امت کی صفوں کے درمیان دشمنی اور نفرت کا سبب نہیں بننا چاہیے اور نہ ہی کسی ایک شخص یا کسی ایک قول کی حمایت میں تعصب رکھنے کا سبب ہونا چاہیے‘ کیونکہ فتویٰ انسانی جِدّ وجُہد کا ثمرہ ہے‘ جس میں غلطی اور درستگی دونوں کا احتمال موجود ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے ایک فتویٰ قطعی طور پر حق ہے‘ البتہ ظنّی طور پر اس کے حق ہونے کا اعتقاد

رکھا جا سکتا ہے‘ کیونکہ اگر ایک فتویٰ کو قطعی طور پر حق جان لیا تو ہم اس کے مخالف کو گنہگار سمجھنے پر مجبور ہوں گے‘ اس لیے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ایک عالم کا قول وہ ’’شرع‘‘ نہیں ہے جس پر تعصب کیا جائے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ ایک قول درست بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی‘ تو پھر اسی قول پر تعصب کرنا جائز ہو گا جو کتاب وسنت کے موافق ہو‘ اور پھر یہ تعصب قرآن وسنت کے لیے ہو گا نہ کہ کسی عالم کے قول کا۔

علماء کے لیے تعصب کا اظہار امت کے درمیان تفرقہ بازی اور لڑائی کا باعث بنتا ہے‘ کیونکہ ان کی تعداد بے شمار ہے‘ برخلاف کتاب وسنت کے لیے تعصب کرنے کے‘ کہ وہ اُمت کو متحد کرنے کا باعث بنتے ہیں‘ کیونکہ کتاب وسنت خود ایک ہیں۔ شیخ الاسلام نے ارشاد فرمایا:

> ’’تو جو شخص رسول اللہ ﷺ کے علاوہ ہر بات میں کسی کی اطاعت واجب قرار دیتا ہے‘ جو کچھ وہ کہے اس کی تصدیق کرنا ضروری سمجھتا ہے اور یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ وہ دین کی جو بھی بات کر رہا ہے اس میں معصوم ہے‘ غلطی سے مبرا ہے تو ایسے شخص نے اپنے اس ممدوح کو رسول اللہ ﷺ کی رسالت میں برابر سمجھ لیا۔ اور ہمیں اس سے غرض نہیں کہ کس کے بارے میں ایسا اعتقاد رکھتا ہے‘ وہ چاہے کوئی صحابی ہو‘ یا نبی کا قرابت دار ہو‘ امام ہو‘ شیخ ہو یا بادشاہوں میں سے کوئی بادشاہ ہو یا کوئی اور شخص ہو۔‘‘ (۱)

اس لیے کسی ایک عالم کے قول پر تعصب رکھنا اور اس کے مخالف سے دشمنی رکھنا ایک مسلمان کا شیوہ نہیں ہے‘ کیونکہ ایسا کرنے کا مطلب ہے کہ اس عالم کو معصوم قرار دیا جا رہا ہے۔ ایک مسلمان کا منتہائے مقصود یہ ہونا چاہیے کہ اس قول کی اتباع کرے جو دلیل پر مبنی ہو‘ نہ کہ اس لیے کہ وہ اس کے اپنے عالم کا قول ہے۔ امت کے علماء ہمارے سب کے علماء ہیں‘ ہم ان کے لیے دعا کرتے ہیں اور دلیل کے سمجھنے میں اور احکام کی وضاحت میں ان کے اقوال سے مدد لیتے ہیں‘ ہم ان میں سے کسی ایک پر تعصب نہیں کرتے‘ اور اگر کسی کے فہم پر اعتماد کرتے ہیں تو اس کے مخالف کو گمراہ نہیں تصور کرتے‘ اور وہ مسائل جن میں کوئی دلیل وارد نہیں ہوئی بلکہ وہ دلائل سے مستنبط کیے گئے ہیں تو ان میں غلطی اور صحت دونوں کا امکان ہے بلا لحاظ وجہ استنباط کے۔

حاشیہ

(۱) جامع الرسائل‘ ۱:۲۷۳۔

مولانا محمد منظور نعمانیؒ اور اباجی (۳)

بسلسلہ حاجی عبد الواحد صاحبؒ کی یادداشتیں (۱۹)

مرتب: پروفیسر حافظ قاسم رضوان

مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ سے قریبی تعلق اور تاثرات کو مختصراً درج کیا جاتا ہے:

ایک موقع پر اواخر ۱۹۴۲ء یا اوائل ۱۹۴۳ء میں مولانا نعمانی کی حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کے ہاں طویل حاضری ہوئی۔ مغرب کے بعد خانقاہ کے صحن میں ایک طرف آپ حضرت کے ساتھ پلنگ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پاس ہی بعض حضرات 'نفی' اثبات' اور کچھ 'اسمِ ذات' کا جہری ذکر کر رہے تھے اور خاص طریقے سے قلب پر ضرب لگاتے تھے۔ اُن دنوں مولانا نعمانی کو یہ ذہنی خلجان تھا کہ خانقاہوں میں ذکر و شغل کے جو خاص طریقے رائج اور وہاں کا معمول ہیں' وہ درست نہیں' بلکہ ایک قسم کی اجتہادی غلطی ہے۔ چنانچہ آپ نے حضرت رائے پوری کی خدمت میں عرض کیا: ''حضرت! ساری عمر دین کے بارے میں جو کچھ پڑھا ہے اور کتابوں میں جو دیکھا ہے' اس سے یہ سمجھا ہوا ہے کہ اصل دین وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ (ہمارے لیے) اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے' اور جس کی تعلیم آپؐ نے صحابہ کرام ؓ کو دی' اور پھر صحابہ کرامؓ سے بعد والوں نے سیکھا' اور جو صحیح نقل روایت کے ساتھ ان سے ہم تک پہنچا۔ اور یہ حضرات جس طرح جہر و ضرب کے ساتھ ذکر کر رہے ہیں' جہاں تک اپنا علم ہے' نہ تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو تعلیم فرمایا تھا' نہ صحابہ کرامؓ نے تابعین سے اس طریقے پر ذکر کرایا' اور نہ تابعین نے اپنے بعد والوں کو یہ طریقہ بتلایا تھا۔ اس لیے ذکر کے اس طریقے کے بارے میں مجھے کچھ خلجان ہے اور میں چاہتا ہوں کہ میرا یہ خلجان اگر کسی غلط فہمی کی وجہ سے ہو تو اس کی تصحیح اور اصلاح ہو جائے۔''

دو دن تو حضرت رائے پوریؒ نے مولانا نعمانی کے سوال کو نظر انداز کیا' اور مغرب کے

بعد خصوصی مجلس کے وقت مسلمانوں کے دیگر اجتماعی مسائل اور تحریکات پر گفتگو فرماتے رہے۔ تیسرے دن نماز فجر کے بعد حضرت اپنے معمول کے مطابق صبح کی سیر کو چلے تو مولانا نعمانی بھی ساتھ تھے۔ دوران گفتگو حضرت رائے پوریؒ نے فرمایا: ''مولوی صاحب! آپ کو شاید یہی تو شبہ ہے کہ یہ چیزیں (ذکر و شغل وغیرہ) بدعت ہیں' یہ بتلایئے کہ بدعت کی تعریف کیا ہے؟'' مولانا نعمانی نے جواب دیا کہ بدعت کی زیادہ محقق تعریف یہ ہے کہ ''دین میں کسی ایسی چیز کا اضافہ جس کے لیے کوئی شرعی دلیل نہ ہو''۔ یہ سن کر حضرت نے فرمایا کہ ''ہاں! ٹھیک ہے۔ لیکن یہ بتلایئے کہ اگر دین میں کوئی چیز مقصود اور مامور بہ ہو' اور اللہ و رسول نے اس کا حاصل کرنا ضروری قرار دیا ہو لیکن زمانے کے حالات بدل جانے کی وجہ سے وہ اس طریقے سے حاصل نہ کی جا سکتی ہو' جس طریقے سے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے زمانے میں حاصل ہو جایا کرتی تھی' بلکہ اس کے واسطے کوئی اور طریقہ استعمال کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو کیا اس نئے طریقے کو بھی آپ دین میں اضافہ اور بدعت کہیں گے؟ (پھر اپنے مقصد کو اور زیادہ واضح کرنے کے لیے فرمایا) مثلاً دین سیکھنا سکھانا ضروری ہے اور اس کا نہایت تاکیدی حکم ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام ؓ کے زمانے میں اس کے لیے صرف صحبت ہی کافی ہو جاتی تھی' تعلیم کا کوئی مستقل نظام نہیں تھا' نہ مدرسے تھے' نہ کتابیں تھیں۔ لیکن بعد میں حالات ایسے ہو گئے کہ اس مقصد کے لیے (صرف) صحبت کافی نہیں رہی' بلکہ کتابوں کی اور پھر مدرسوں کی بھی ضرورت پڑ گئی۔ تو اللہ کے بندوں نے کتابیں لکھیں اور مدرسے قائم کیے' اور اس کے بعد سے دینی تعلیم کا سارا سلسلہ اسی سے چلا۔ تو کیا تعلیم اور تعلّم کے طریقے میں اس تبدیلی کو بھی دین میں 'اضافہ' اور 'بدعت' کہا جائے گا؟'' اس پر مولانا نعمانی نے عرض کیا کہ ''نہیں! دین میں اضافہ جب ہوتا ہے جبکہ مقصود اور امر شرعی سمجھ کر کیا جائے۔ لیکن اگر کسی دینی مقصد کے حاصل کرنے کے لیے قدیمی طریقہ کے ناکافی ہو جانے کی وجہ سے کوئی نیا جائز طریقہ اختیار کر لیا جائے' تو اس کو دین میں اضافہ نہیں کہا جائے گا اور نہ وہ بدعت ہوگا۔''

اس پر حضرت نے فرمایا کہ ''مولوی صاحب! سلوک کے جن اعمال و اشغال پر آپ کو بدعت ہونے کا شبہ ہے' ان سب کی نوعیت یہی ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی مقصد سمجھ کر نہیں کی جاتی' بلکہ یہ سب اللہ سے وہ تعلق پیدا کرنے کے لیے کرایا جاتا ہے جو دین میں مقصد اور مامور بہ ہے۔''

اسی سلسلۂ کلام کے آخر میں حضرت شاہ رائے پوریؒ نے فرمایا: ''خدا معلوم لوگ تصوف کو

کیا سمجھتے ہیں۔ تصوف تو بس اخلاص اور عشق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے‘ اور جو کام عشق کی طاقت سے اور اخلاص کی برکت سے ہوسکتا ہے‘ وہ اس کے بغیر نہیں ہوسکتا۔‘‘

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

آخر میں مولانا نعمانی نے شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کی چند ان باتوں کا ذکر کیا ہے‘ جن سے وہ خاص طور پر متاثر ہوئے:

(اوّل) حضرت کی زندگی میں تصوف کا مقصد اور اس کا مغز پایا جاتا تھا۔ رسوم تصوف کے نہ خود پابند تھے اور نہ ہی دوسروں سے پابندی چاہتے تھے۔ نسبت اور تعلق مع اللہ کے حصول کے لیے بقدرِ امکان کثرتِ ذکر وفکر پر زور دیتے تھے۔ لوگوں کے حالات اور مختلف طبائع کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کے مطابق شغل تجویز فرماتے۔ جو لوگ دین وملت کی مختلف خدمات میں لگے ہوتے‘ تو آپؒ ذکر کے ساتھ اس خدمت کو ہی ان کا شغل اور وظیفہ قرار دیتے‘ بس اخلاصِ نیت کی تاکید فرماتے کہ یہی وہ اکسیر ہے جو ہر عمل کو عبادت اور قربتِ الی اللہ کا وسیلہ بنا دیتی ہے۔

(دوم) دنیا کے جھمیلوں سے بالکل لاتعلق اور خانقاہی درویش ہونے کے باوجود حضرت رائے پوریؒ دنیوی معاملات کو بہت بہتر طریقے سے سمجھتے تھے۔ خُدام کی طلب پر اس قسم کے معاملات میں ایسا صائب مشورہ دیتے کہ ان امور کے کسی اعلیٰ ماہر سے بھی اس سے زیادہ کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اسی طرح قومی اور سیاسی تحریکات اور ملکی معاملات سے بظاہر لاتعلق ہونے کے باوجود ان کے بارے میں ایسی صحیح اور متوازن رائے رکھتے تھے کہ جس سے متعلقہ رہنمائے قوم بھی اعلیٰ رہنمائی اور بصیرت حاصل کریں‘ لیکن خُدام کو مکمل آزادی تھی کہ اس دائرے میں اپنی اپنی رائے قائم کریں اور اس پر عمل پیرا ہوں۔

(سوم) حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کو اللہ تعالیٰ نے توکّل (صرف اللہ پر اعتماد اور بھروسہ) اور تبتّل (سب سے کٹ کر صرف اللہ سے وابستگی) کا وہ اعلیٰ مقام عطا فرمایا جو کہیں اور میری نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن اس کے ساتھ حضرت سلسلۂ اسباب اور انسانی تدبیر وکوشش کے قدرتی نظام پر بھی بے حد زور دیتے تھے اور نظامِ زندگی میں ترکِ اسباب کے سخت مخالف تھے۔ ۱۹۵۰ء میں حضرت رائے پوری نے اپنا آخری حج کیا‘ اس کے احوال بیان کرتے ہوئے خود فرمایا: ’’میں دیکھتا تھا کہ اللہ کے بندے بیت اللہ سے چمٹ چمٹ کے اور اس کا غلاف

ہاتھوں میں پکڑ پکڑ کے اور خوب رو رو کے ان باتوں کی دعائیں کرتے تھے جن کے لیے وہ اس عالمِ اسباب میں امکانی کوشش بھی نہیں کرتے۔ ان کا یہ حال دیکھ کر میرے دل سے فوارے کی طرح یہ بات نکلتی تھی کہ تمہاری ان دعاؤں سے بلا پٹرول اور ڈرائیور کے ایک موٹر تو چل نہیں سکتی‘ ساری دنیا الٹ پلٹ کیسے ہو جائے گی!‘‘ اسی اصول کے تحت حضرت خود بھی دوا‘ علاج اور پرہیز کا اہتمام فرماتے اور دوسروں کو بھی اس کی تاکید کرتے‘ لیکن قلب اس یقین سے معمور رہتا کہ کارساز اور مؤثر صرف اللہ تعالیٰ کا حکم ہے‘ مگر اشیاء میں خاصیتیں بھی اللہ نے ہی رکھی ہیں اور اسی نے بندوں کو بھی تدبیر واسباب کے استعمال کا حکم دیا ہے۔ (صرف اسباب پر ہی نگاہ رکھنا مقامِ ایمان کے منافی ہے اور ان کا بالکل انکار بھی واضح غلطی ہے‘ اعتدال کی راہ ہی شرعاً مطلوب ہے۔ راقم)

مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے مولانا محمد الیاسؒ سے متعلق تاثرات اختصار سے درج ذیل ہیں:

حضرت رائے پوریؒ نے ہی مولانا نعمانی کو مولانا محمد الیاسؒ سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا۔ اس پر آپ نے مولانا کی خدمت میں بستی نظام الدین‘ دہلی آنا جانا شروع کر دیا۔ یہ مولانا کی حیات کا آخری دور تھا‘ بیماری اور ضعف زوروں پر تھے۔ ایسے ہی ایک حاضری کے موقع پر مولانا محمد الیاس بستر پر لیٹے ہوئے مصافحہ کرنے کی بجائے اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ جب مولانا نعمانی نے بیماری کی وجہ سے لیٹنے اور آرام کرنے پر اصرار کیا تو فرمایا: ’’کچھ بیمار نہیں ہوں‘ تم لوگوں کا بیمار ڈالا ہوا ہوں‘ آ کے دین کا کام کرو‘ ان شاء اللہ میں اچھا ہو جاؤں گا‘‘۔ جب مولانا نے وقت دینے اور کام کرنے کا وعدہ کیا تو حضرت کو قدرے سکون ہوا اور آپ سہارا لے کر نیچے فرش پر بیٹھے اور کچھ دیر مزید دین کی محنت پر گفتگو فرماتے رہے۔

کچھ تبلیغی اسفار میں مولانا محمد الیاس کے ساتھ رہنے پر مولانا نعمانی کا تاثر یہ تھا: ’’پہلی دفعہ گویا آنکھوں نے دیکھا کہ ’دل والوں‘ اور ’دماغ والوں‘ میں کیا خاص فرق ہوتا ہے‘‘۔ بالکل آخری حالت میں بھی دین کے فکر اور مسلمانوں کی دین سے دوری کے درد کا غلبہ اتنا زیادہ تھا‘ کہ جس نے دیکھا نہیں وہ سن کر اور پڑھ کر نہیں سمجھ سکتا۔ کمزوری کی وجہ سے اتنی آواز بھی نہیں نکل سکتی تھی کہ قریب والا آدمی سن سکے۔ بعض خاص خُدام کو اشارہ فرماتے کہ اپنے کان میرے لبوں کے ساتھ لگا دو۔ ایسا کرنے پر آپ فرماتے کہ میری طرف سے یہ بات حاضرین تک پہنچا دو۔ آپ کے وطن کاندھلہ سے چند اعزّہ بیمار پُرسی کے لیے آئے تو فرمایا کیوں آئے ہو؟ انہوں نے عرض کیا کہ آپ کی خبر لینے آئے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ ’’جو مرنے اور مٹنے ہی

کے لیے ہے‘ اس کی خبر اور خیریت لینے اتنی دور سے آئے ہو۔ اور رسول اللہ ﷺ کا لایا ہوا دین عزیز مٹ رہا ہے‘ اس کی خبر لینے کی کوئی فکر نہیں!‘‘

آخر میں مولانا نعمانی نے اپنا خاص احساس یوں بیان کیا ہے: ’’واقعہ یہ ہے کہ حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی اس آخری بیماری میں حضرت کی خدمت میں قیام کی جو توفیق ملی‘ یہ اس گنہگار پر اس کے ربِ کریم کی خاص الخاص نعمت ہے۔ دین کی بہت سی حقیقتیں جو کتابوں کی عبارتوں سے پوری طرح سمجھ میں نہیں آ سکتی تھیں‘ حضرت کا حال دیکھ کر الحمد للہ کچھ سمجھ میں آ گئیں۔ اور رسول اللہ ﷺ اور خواصِ امت کے احوال کا سمجھنا کچھ آسان ہو گیا۔‘‘

ساتھ ہی اپنے ایک دوست اور ہم سبق کے واقعہ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے تصوف کی ایک کتاب کے حوالے سے مولانا اشرف علی تھانویؒ سے اس کے مطالعہ کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا: ’’مولانا! میں نے کتب زیادہ نہیں دیکھیں‘ ہاں ایک قطب دیکھا ہے‘‘۔ اس سے حضرت کا اشارہ اپنے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی طرف تھا۔

مولانا محمد الیاس کا ایک طویل ملفوظ درج ذیل ہے:

’’علم اور ذکر کو مضبوطی سے تھامنے کی زیادہ سے زیادہ ضرورت ہے‘ مگر علم و ذکر کی حقیقت اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے۔ ذکر کی حقیقت ہے عدم غفلت اور فرائضِ دینی کی ادائیگی میں لگا رہنا‘ یہ اعلیٰ درجہ کا ذکر ہے۔ اس لیے دین کی نصرت اور اس کے فروغ کی جدوجہد میں مشغول رہنا ذکر کا اونچا درجہ ہے‘ بشرطیکہ اللہ کے اوامر اور مواعید کا خیال رکھتے ہوئے ہو۔ اور علم سے مراد دینی مسائل اور دینی علوم کا صرف جاننا نہیں ہے۔ دیکھو یہود اپنی شریعت اور اپنے آسمانی علوم کے کیسے عالم تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے ناخنوں تک کے حُلیے اور نقشے حتیٰ کہ ان کے جسموں کے تل کے متعلق بھی ان کو علم تھا‘ لیکن کیا ان باتوں کے صرف جاننے نے ان کو کوئی فائدہ دیا؟...... علم کے لیے جو وضع محمدی تھی (یعنی طلب اور عظمت و محبت کے ساتھ صحبت و اختلاط سے علم حاصل کرنا اور زندگی سے زندگی سیکھنا) اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے ذریعے جتنا علم بڑھتا تھا‘ اسی قدر اپنے جہل اور اپنی علمی درماندگی کا احساس ترقی کرتا تھا۔ اور علم حاصل کرنے کا جو طریقہ اب رائج ہو گیا ہے‘ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ علم جتنا آتا ہے‘ زعم اسی سے زیادہ پیدا ہوتا ہے‘ اور پھر زعم سے کبر پیدا ہوتا ہے اور کبر جنت میں نہیں جائے گا۔ علاوہ ازیں علم کے زعم کے بعد تحصیل علم کی تڑپ نہیں جس کی وجہ سے علمی ترقی ختم ہو جاتی ہے۔‘‘

؎ خرد دیکھے اگر دل کی نگاہ سے
جہاں روشن ہے نورِ لا الٰہ سے

مولانا محمد منظور نعمانی کے مولانا حسین احمد مدنیؒ سے تعلق اور تاثرات مختصراً یوں ہیں:

مولانا نعمانیؒ کا مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بھی خاص تعلق رہا ہے۔ جب مولانا دیوبند داخل ہوئے تو اس وقت مولانا حسین احمد مدنیؒ کا وہاں آنے جانے اور خطاب کرنے کا معمول تھا۔ مولانا نعمانی کی وہاں سے فراغت کے بعد مولانا مدنی دیوبند کے اساتذہ میں شامل ہو کر آخر کار صدر مدرس کے منصب پر فائز ہوئے۔ بعد میں آپ کا مولانا مدنی سے تعلق بڑھتا اور باہمی قرب ہوتا گیا۔ مولانا نعمانی نے حضرت مدنی کی حیات کے چند خاص پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے‘ جن سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ اوّل کہ حضرت مولانا مدنی کے قریب اور ساتھ کھڑے ہو کر جب کبھی نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا‘ تو ہمیشہ محسوس ہوا کہ حضرت مولانا وہ نماز پڑھتے جو ہم کو نصیب نہیں‘ خاص کر جب مولانا فجر کی نماز میں قنوتِ نازلہ پڑھتے تھے تو بعض اوقات تو خطرہ ہونے لگتا کہ کہیں قلب نہ پھٹ جائے۔ گویا جس بندے کو نماز کی حقیقت نصیب ہوئی‘ اسے بندگی کا کمال عطا ہو گیا۔ ’’اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ‘‘ سے بھی یہی مفہوم حاصل ہوتا ہے کہ نماز کا دینی نظام میں ایک خاص بنیادی مقام ہے۔ آخری کئی سال حضرت کے گھٹنوں میں مستقل تکلیف رہتی تھی‘ خاص کر سجدے جانے اور دوبارہ اٹھنے میں سخت مشقت ہوتی تھی۔ لیکن اس تمام عرصہ میں حضرت مدنیؒ نہ صرف فرائض بلکہ سُنن اور نوافل بھی معمول کے مطابق طول قیام کے ساتھ ہی ادا فرماتے تھے۔ لگتا تھا کہ دیکھنے والا جس چیز کو سخت تکلیف اور مشقت سمجھ رہا ہے‘ حضرت کے لیے اسی میں راحت و لذت ہے۔ یہ حال اسی بندے کا ہو سکتا ہے جس کو حضور ﷺ کے فرمان ’’قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ‘‘ سے حصہ وافر ملا ہو۔ حقیقت نماز سمجھنے کے لیے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی یہ عبارت خاصی معاون ثابت ہو سکتی ہے: ’’اللہ کے سامنے حضوری اور سکینت اور محبت آمیز تعظیم کے ساتھ اس کے جلال و جبروت کا تصور اور گہرا دھیان‘ بس یہی نماز کی روح ہے۔‘‘ (حجۃ اللہ البالغہ)

دوم کہ مولانا مدنیؒ کو محبت اور اتباعِ رسول ﷺ کا ایک خاص مقام حاصل تھا۔ حُبِ رسولؐ کی وجہ سے حضور ﷺ کی سنتوں‘ آپؐ کے عادات و اطوار اور آپؐ سے نسبت رکھنے والی تمام چیزوں سے مولانا کو خصوصی انس تھا۔ مثلاً مدینہ منورہ کی مٹی سے مولانا مدنی کو قلبی تعلق تھا‘ تکیہ

چمڑے کا استعمال فرماتے تھے‘ کھانا کھاتے وقت نشست ہمیشہ سنت کے مطابق ہوتی تھی‘ ذاتی دسترخوان پر سالن ایک بڑے برتن میں ہوتا اور سب رفقاء اور مہمان دائرے کی شکل میں بیٹھے اسی برتن میں اکٹھے کھاتے۔ نشست و برخاست‘ لباس اور جوتا پہننے میں بھی ہمیشہ سنت کی پیروی فرماتے۔ آپ کی تشریف آوری پر اگر ارادت مند کھڑے ہوتے تو سخت ناراضگی کا اظہار فرماتے کہ ’’آپ لوگ کیوں کھڑے ہوئے‘ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو اس طرح کھڑے ہونے سے ناگواری ہوتی تھی!‘‘ بقول مولانا نعمانی: ’’اتباعِ سنت کا اہتمام اور شغف‘ عبادات میں ہی نہیں بلکہ امورِ معاشرت اور عادات میں بھی جس قدر فرماتے تھے‘ تلاش کرنے والے کو اس کی مثالیں خواص اہل دین میں بھی شاذ و نادر ہی ملیں گی۔‘‘

سوم کہ حضرت مدنی کے اندر حد سے زیادہ تواضع اور خاکساری تھی۔ حضرت کے حالات اور مقام سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ جو اونچے سے اونچا دینی‘ روحانی اور سیاسی مقام آپ کو حاصل تھا‘ وہ کم ہی کسی ہستی کو حاصل ہوتا ہے۔ ان تمام عظمتوں اور پابندیوں کے باوجود آپ میں تواضع اور انکساری اس حد تک تھی کہ جن کو قریب رہنے کا موقع نہ ملا ہو‘ وہ اس کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے۔ بقول مولانا نعمانی: ’’بعض اوقات راقم سطور کو خیال ہوتا تھا کہ حضرت کا اتنا تواضع شاید دوسروں کے لیے مضر ہو۔‘‘

درج ذیل واقعہ سے ہی اس کیفیت اور مقام کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حضرت کے ایک شاگرد نے خود بیان کیا کہ ایک مرتبہ حضرت ریل سے سفر فرما رہے تھے اور یہ بطورِ خادم ساتھ تھے۔ راستے میں انہیں استنجے کا تقاضا ہوا‘ لیکن بیت الخلاء کی غلاظت دیکھ کر واپس اپنی جگہ آ بیٹھے۔ تھوڑی دیر کے بعد مولانا مدنی اپنی جگہ سے اٹھے اور بیت الخلاء میں داخل ہو کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ کچھ دیر بعد باہر تشریف لا کر خادم سے ارشاد فرمایا کہ اب چلے جاؤ۔ انہوں نے اندر جا کر دیکھا کہ حضرت نے ان کی واپسی کی وجہ سے ہی بیت الخلاء کو اندر جا کر لوٹے کی مدد سے صاف کیا اور پھر باہر آئے۔ اب کہاں ملے گی ایسی تواضع اور بے نفسی؟

ایک موقع پر حضرت مدنی کو مولانا نعمانی اور چند دوسرے نیاز مندوں کی طرف سے یہ گزارش کی گئی کہ ضعف پیری اور بعض دیگر مصالح کی بنا پر حضرت صرف وہ سفر فرمایا کریں کہ جس کی خاص ضرورت اور اہمیت ہو۔ اور یہ جو لوگ معمولی معمولی مقامی ضرورتوں اور جلسوں کے لیے حضرت کو تکلیف دیتے ہیں‘ یہ سلسلہ اب بند ہونا چاہیے۔ حضرت مدنی نے فرمایا کہ میں کیا کروں‘ لوگ آ جاتے اور اصرار کرتے ہیں۔ عرض کیا گیا کہ جب حضرت فیصلہ فرما لیں گے تو

لوگوں کو بھی معلوم ہو جائے گا اور وہ پھر دوبارہ نہیں آئیں گے۔ تو فرمایا: ’’مجھ سے تو یہ ہو نہیں سکتا کہ اللہ کے بندے آئیں اور وہ کہیں چلنے کے لیے اصرار کریں اور میں انکار پر جما رہوں!‘‘ دوبارہ جب ضعف پیری اور وقت کے قیمتی ہونے کی طرف توجہ دلائی گئی کہ اسے خاص ضرورت اور موقع پر ہی صرف ہونا چاہیے‘ تو پھر حضرت نے خاکساری‘ انکساری اور تواضع کے ڈوبے ہوئے لہجے میں ارشاد فرمایا: ’’آپ لوگ یہ کیا کہتے ہیں‘ میں کیا ہوں اور میری کیا قیمت ہے۔ یہ مٹی کا جسم ہے‘ جب تک چل رہا ہے اس سے کام لے لینا چاہیے۔‘‘

چہارم کہ مولانا حسین احمد مدنیؒ میں تواضع اور انکساری کے برعکس یہ وصف بھی تھا کہ جس بات اور راستے کو وہ حق سمجھ لیتے تھے‘ اس کے بعد کسی کا ساتھ دینا یا نہ دینا‘ کسی کی رضامندی یا ناراضگی یا کوئی زلزلہ اور طوفان بھی ان کو اپنے راستے سے نہیں ہٹا سکتا تھا۔ اس ضمن میں سب سے روشن مثال ان کا سیاسی مسلک اور اس سے متعلقہ سرگرمیاں ہیں۔ واقفانِ حال جانتے ہیں کہ مولانا کو اس راہ میں کیسے کیسے ناموافق حالات اور سخت ترین سیاسی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا‘ لیکن آپ کے پائے استقامت میں کوئی لغزش نہیں آئی‘ بلکہ آپ کی یکسوئی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ کسی دوسرے پہلو کو سننے اور سوچنے کے لیے بھی اپنے آپ کو تیار نہ کر پاتے تھے‘ گویا اس مسئلے کا تعلق ان کے دماغ سے زیادہ قلب اور روح سے ہے۔

پنجم کہ مولانا مدنی کی ذات میں ایثار و فیاضی اور مہمان نوازی کے جو نمونے تھے‘ اس کی مثالیں تاریخ کی کتابوں میں بھی کم ہی مل سکیں گی۔ مولانا کا دولت کدہ ایسا وسیع مسافر خانہ اور مہمان خانہ تھا کہ دوسروں سے سن کر اس کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ برسہا برس سے مولانا کے مہمانوں کا اوسط چالیس پچاس روزانہ سے کم نہ تھا۔ ان متنوع مہمانوں میں کئی بیعت کرنے والے ہوتے‘ کچھ زیارت اور دعا کی غرض سے آتے‘ کچھ سفارش حاصل کرنے والے ہوتے‘ کئی ذکر و فکر اور روحانی تربیت کا چلّہ کرنے کے لیے حاضر ہوتے اور کچھ اپنے مختلف دنیاوی کاموں سے دیوبند آتے اور حضرت کی مہمان نوازی سے فائدہ اٹھانے کے لیے کھانے کے وقت آ موجود ہوتے۔

مولانا مدنیؒ بھی مہمانوں کے ساتھ بیٹھتے اور بلا تخصیص سب لوگ ایک جیسا کھانا کھاتے۔ اگر کسی خاص مہمان کے لیے کوئی تکلف کیا جاتا‘ مثلاً پلاؤ پکتا‘ ثرید تیار ہوتا یا دیوبند کی مشہور فرنی آتی‘ تو سب حاضرین اس میں بلا امتیاز شامل ہوتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ روزمرہ کی اس طرح بے مثال مہمان نوازی اور اسی طرح کی بعض دوسری للّٰہی مدوں میں حضرت مدنی

کے ہاتھوں سے جو کچھ دوسروں پر خرچ ہوتا تھا‘ خود اپنی ذات اور اہل و عیال پر اس کا شاید چوتھائی بھی خرچ نہ ہوتا ہوگا۔

آخر میں مولانا نعمانی نے ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے خاص مقبول بندوں کی نشانی یہ بتائی گئی ہے کہ انہیں دیکھ کر اور ان کے پاس بیٹھ کر خدا یاد آتا ہے۔ اس ضمن میں مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے اپنا خاص تاثر بیان کیا کہ حضرت مدنیؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کو دیکھ کر یا ان کے پاس بیٹھ کر دل میں یادِ خدا اور فکرِ آخرت پیدا ہوتی تھی۔ اسی حوالے سے مولانا نعمانی کا مزید ارشاد ہے کہ کسی بندے کے ظاہری احوال و اعمال سے اس کے اندرونی حال کے بارے میں جہاں تک رائے قائم کرنے کا حق ہے‘ اس کی بنا پر پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شح اور حُبِّ مال سے حضرت مدنی کے قلب و روح کو ایسا صاف کر دیا تھا کہ اس کے غبار کا کوئی ذرہ بھی وہاں نہیں رہا تھا‘ اور ان شاء اللہ حضرت مولانا اس قرآنی بشارت کے خاص مستحقین میں ہوں گے: ﴿وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۹﴾ (الحشر) ”اور جو نفس کے بخل/نفس کی حرص سے بچالیا گیا تو وہی لوگ کامیاب ہونے والے/مراد پانے والے ہیں۔“

اگرچہ اباجی کا مولانا محمد منظور نعمانی سے قلبی تعلق چالیس کی دہائی کا ہے‘ مگر اباجی کے دستیاب روزناموں میں مولانا کا قدرے تفصیل سے ذکر دسمبر ۱۹۵۵ء میں ملتا ہے۔ اباجی نومبر ۵۵ء کے آخر میں ہندوستان کے سفر پر گئے تھے‘ جہاں آپ نے حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ‘ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ اور مولانا محمد یوسفؒ امیر تبلیغی جماعت کے ہاں باری باری قیام کیا۔ حضرت رائے پوری کے ہاں ٹھہرنے کے دوران مولانا نعمانی مع رفقاء تشریف لے آئے اور اباجی سے بھی مختلف موضوعات پر تفصیلی نشستیں ہوئیں۔ ۹ دسمبر کی ایک گفتگو کا ذکر کچھ یوں ہے: ”صبح نعمانی صاحب نے جماعت اسلامی کے بارے میں قدرے تفصیلی گفتگو کی۔ علمائے حق کو ان سے شدید اختلاف ہے‘ وجہ ایسی نمایاں نظر نہیں آتی‘ تو یہ غصہ منجانب اللہ القا ہوتا ہے‘ جو ملاء اعلیٰ سے ملاء ادنیٰ اور وہاں سے آدمیوں کے قلوب میں القا ہوتا ہے‘ کیونکہ یوں کہنا کہ امت نے تیرہ سو سال سے دین کے اعلیٰ معنی کھو دیے ہیں‘ تفسیر بالرائے کا دروازہ کھولنا ہے۔ اب کل جو آدمی جس لفظ کے جو معنی چاہے‘ لے لے اور جو تفسیر چاہے کر دے۔“ آگے مغرب کے بعد حضرت رائے پوری کی مجلس کے حوالے سے تحریر ہے: ”(دین کی) چار بنیادی اصطلاحیں مودودی صاحب نے لکھی ہیں: اللہ‘ رب‘ عبادت‘ دین۔ اللہ بمعنی حاکم‘

عبادت بمعنی اطاعت‘ اس میں محبت اور سلوک کا نام نہیں لیا‘ محض جلال کا اظہار ہے‘ جمال کا نہیں‘ عبادت میں محبت اور اللہ کو راضی کرنے کا عنصر مفقود معلوم ہوتا ہے۔ مودودی صاحب آدمی نہایت ذہین ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں انہوں نے جان لیا کہ آزادی آ کر رہے گی۔ ۱۹۴۱ء میں مستری محمد صدیق مرحوم نے اطاعت کو عبادت قرار دینے کا خیال پیدا کیا۔ مودودی صاحب خود تو رئیسانہ زندگی کے عادی ہیں‘ جس کا ایک حصہ تن آسانی اور کاہلی بھی ہے۔ اور ان کے نظریات اور افعال میں کچھ شبہ بھی وارد ہوتا ہے کہ بالکل لوجہ اللہ اور خالص نہیں۔ اللہ رحم فرمائے اور اصلاح فرمائے۔“

یہ تبصرہ اس لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ مولانا نعمانی ایک وقت جماعت اسلامی کے تاسیسی رکن اور اس کے نائب امیر رہ چکے تھے اور اباجی نے بھی دارالاسلام‘ پٹھانکوٹ جا کر مولانا مودودی کی خدمت میں کچھ عرصہ گزارا تھا‘ لیکن شرحِ صدر نہ ہوا۔ گویا یہ رائے مخالفوں کی نہیں بلکہ ہمدردوں کی ہے۔ جماعت اسلامی کی مناسبت سے ہی اباجی کا اگست ۱۹۵۵ء کا ایک اظہارِ خیال یوں ملتا ہے: ”جماعت اسلامی کی ابتدائی شدت اب مع سود ادا ہو رہی ہے۔ سید سلیمان کے مضمون پر تبصرہ نصر اللہ خان عزیز کا‘ عاجز سے مسجد میں خطاب ایک جنونی کا‘ دارالاسلام میں تقریریں امین احسن اصلاحی اور خود مودودی صاحبان کی‘ مضامین نعیم صدیقی کے قلم سے‘ ایک مسلسل تلخی کی تاریخ ہے‘ اب اسی کو بھگت رہے ہیں۔ ہمیں تب بھی افسوس تھا‘ اب بھی افسوس ہے۔“

جماعت اسلامی کی اسی انتہا پسندی اور شدت کی بازگشت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے ہاں یوں ملتی ہے: ”مودودی صاحب کے متعلق حضرت مولانا نے فرمایا کہ وہ علمائے حق کے راستے سے ہٹا ہوا ہے“۔ نومبر ۱۹۵۷ء میں شاہ عبدالقادر رائے پوری لاہور میں صوفی عبدالحمید کے ہاں تشریف فرما تھے۔ اباجی کی وہاں مجلس میں روزانہ حاضری ہوتی اور کئی مرتبہ شب بسری کا بھی پروگرام ہوتا تھا۔ وہیں اواخر نومبر میں مولانا محمد منظور نعمانی بھی تشریف لے آئے اور دونوں پرانے دوستوں کی باہمی ملاقات میں تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ نومبر کا آخری جمعہ مولانا نعمانی نے مسجد نیلا گنبد‘ لاہور میں پڑھایا اور پُرمغز تقریر کی۔ ۲ دسمبر کو مولانا نعمانی اباجی کے ہمراہ ہی سواری میں گھر آ گئے۔ وہیں اکٹھے ناشتہ اور دوپہر کا کھانا ہوا۔ ساتھ ہی تفصیلی نشست اور باہمی افہام و تفہیم کا موقع ملا۔ اباجی کے روزنامچے کی تحریر کچھ یوں ہے: ”مجلس ہندوستان میں

مسلمانوں پر تین دور۔ جان و مال کا خطرہ' گاندھی کی موت (قتل) اور (نتھو رام) گوڑ سے (قاتل) کا بیان۔ جان کا خطرہ موقوف' مگر سوشل بائیکاٹ جاری' مایوسی اور مردگی۔ ۱۹۵۲ء (اور) ۵۷ء کا انتخاب' مسلمانوں کے ووٹ کی قدر' اب مسلمان اپنا اخلاق پیدا کرے تو اپنا مقام حاصل کرسکتا ہے۔ مشرقی پنجاب میں مسلمان کی غیر حاضری' اسلام کی تبلیغ میں بہتری کے آثار''۔ اس طویل تبادلہ خیال میں مودودی صاحب کے حوالے سے یہ مختصر نکات ملتے ہیں: ''مودودی کا کچا چٹھا' دین پر عمل کا جذبہ نہیں' لاپرواہی' ہاں کر کے عمل نہیں' ادارہ کی تشکیل' رخصت' ادارہ ختم' دوبارہ ملاقات' تبادلہ خیالات' جماعت اسلامی' قیام پٹھانکوٹ' مودودی صاحب کا مزاج (مولانا مودودیؒ کے بارے میں ان مختصر اور جامع تبصروں کو پڑھتے ہوئے' یہ خیال رہے کہ ان کا تعلق جماعت اسلامی کے ابتدائی دور سے ہے' وقت کے ساتھ مزید تبدیلی بھی آتی گئی۔ راقم)

۴دسمبر کو مولانا نعمانی' اباجی اور دیگر رفقاء ایک مشترک دوست کے ہاں ناشتہ پر جمع ہوئے۔ یہاں تصوف کے حوالے سے مولانا کی گفتگو کے نکات یہ ہیں: ''گفتگو نعمانی صاحب بابت تصوف۔ حضرت رائے پوری کا سمجھانا' صحبت کی کمی ذکر سے پوری۔ (حضرت مولانا) شیخ الحدیث کی مجلس' حضرت (مولانا محمد الیاس) دہلوی کی خدمت' ہفتہ کا وعدہ' لکھنؤ' کام میں لگے۔ ملفوظات حضرت دہلوی' مولانا یوسف کے طرز (عمل) میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے''۔ دوپہر کا کھانا ایک اور مشترک دوست کے ہاں سلطان فونڈری' بادامی باغ میں کھایا گیا۔ شام کو مولانا نعمانی اور اباجی کی دوبارہ محفل جمی۔ ''نعمانی صاحب نے مروت اور مداہنت پر سیر حاصل بحث کی۔ تبلیغ کا فرض ایک بار میں ادا ہو جاتا ہے' باقی رہی اصلاح کی کوششیں' جب بار بار کہنے سے بھی اصلاح نہیں ہوتی تو توقف کرے۔ خدمت اور خلق سے دل بستگی کی کوشش کرے''۔ رات مولانا اباجی کے ہاں رہے اور علی الصبح لائل پور (فیصل آباد) سدھارے۔

۱۱دسمبر کی صبح اباجی' مولانا محمد منظور نعمانی اور چند دوست حضرت رائے پوریؒ کے ہاں جمع ہوئے تو جماعت اسلامی کے بارے میں پھر ایک تفصیلی گفتگو چھڑ گئی' جس کا اندراج روز نامچے میں اس طرح سے ہے: مودودی صاحب کے مزاج میں تقویٰ نہیں' دل سے اس کا تقاضا نہیں۔ پہلے قوت کی نفی اور دین کی ترغیب تھی' اب قوت کی ترغیب اور دین میں مداہنت ہے۔ دہلی کانفرنس کے بعد نعمانی صاحب سے خط و کتابت میں پینترا بدلا' ایک محاذ قائم کرنے کی کوشش

کی۔ اپنے نفاق کی نفی اور دوسروں پر نفاق کا الزام۔ جماعت پہلے بھی کچھ شبہ رکھتی تھی' خصوصاً دین' دولت اور عالم لوگ (کے حوالے سے)' مگر قوت جماعت میں تھی۔

ختم نبوت کی تحریک کے بعد موت کی سزا سے مودودی صاحب کی شہرت اور قوت میں اضافہ ہوا' اب ڈکٹیٹر (آمر) کی طرح اپنے آپ کو جماعت اور شوریٰ سے بے نیاز سمجھتے ہیں۔ نیا طرز اور نظریہ یوں ہے کہ صحابہؓ کے بعد قرآن مجید کے الفاظ کا تواتر ہے' معانی کا تواتر نہیں رہا اور بڑے سے بڑے بزرگ بھی غلطیوں میں مبتلا ہو گئے' یعنی سلف صالحین دین میں سند نہیں۔ ان کا کہنا یا نہ کہنا وزن نہیں رکھتا۔ (حضرت علیؓ کا قول ہے کہ قرآن نہیں بولتا' اس کے سمجھنے والے بولتے ہیں۔) یہ خود کفر یا فتنہ عظیمہ نہ ہو' مگر ہر فتنے کا باب اور بنیاد ہو سکتی ہے (علامہ مشرقی کا طرز' مولوی کا غلط مذہب)۔ حضرت رائے پوری اور حضرت دہلوی کے تاثرات۔ جماعت اسلامی کُل خیر' خیر غالب' مذبذب' شر غالب' چاروں مراحل طے ہوئے۔ اگلے دن اباجی نے مولانا نعمانی کو بذریعہ ریل کراچی روانہ کیا اور ۱۹ دسمبر کو ان کی واپسی ہوئی۔ ۲۶/دسمبر کو اباجی نے مع رفقاء مولانا کو الوداع کہا اور وہ براستہ واہگہ انڈیا روانہ ہوئے۔

اوائل اگست ۱۹۵۹ء میں اباجی نے بزرگوں اور دوستوں کی ملاقات کے لیے انڈیا کا سفر اختیار کیا۔ وہاں حضرت رائے پوری' حضرت شیخ الحدیث اور مولانا محمد یوسف جیسے اکابرین سے ملاقات کے ساتھ ساتھ مولانا نعمانی اور علی میاں سے بھی پرانی یادیں تازہ ہوئیں۔ حضرت رائے پوری کی خدمت میں حاضری کے بعد حضرت شیخ کے ہاں اباجی سہارنپور گئے تو علی میاں کے ساتھ مولانا نعمانی سے بھی وہیں ملاقات ہوگئی۔ ''شام کے بعد مولانا محمد منظور نعمانی کے ساتھ مجلس کی۔ تبلیغ کا علیحدہ طریقہ اب موقوف ہو گیا ہے اور دل اچاٹ ہو گیا ہے' اب طبیعت ہی ادھر نہیں جاتی۔ کسی کے ہمراہ شریک ہو جائیں تو اور بات ہے' مگر اب خود یہ کام کرنا محال ہے۔ لکھنؤ میں اپنے طور پر علیحدہ طریقے سے جو کام شروع کیا تھا اور دہلی کی جماعتوں کا وہاں آنا پسند نہ کرتے تھے' اب وہ مرحلہ بھی گزر چکا ہے اور ان جماعتوں کے لیے کوئی روک نہیں' کیونکہ اب اپنا کوئی کام نہیں رہا۔ اب پڑھانے میں جی لگتا ہے۔ اور ندوہ میں نعمانی صاحب مسلم پڑھاتے ہیں اور علی میاں بخاری۔ میری طبیعت کا حال سن کر نعمانی صاحب نے یہ مشورہ دیا کہ عاجز کے لیے کوئی طبیعت کو متوجہ کرنے والی مصروفیت ضروری ہے جو طبیعت کو ماضی میں سے نکال لائے''۔ اگلے روز مولانا نعمانی کی واپسی ہوئی۔

(جاری ہے)

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے ”شعبہ تحقیق اسلامی“ (IRTS) کے زیرِ انتظام ابلاغِ عامہ وافادۂ عام کی ویب سائٹس

- www.tanzeemdigitallibrary.com بانی تنظیم وصدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے دروس، خطابات وتصنیفات کا جملہ تحریری مواد یونی کوڈ کے سرچ ایبل فارمیٹ (Unicode searchable format) میں دستیاب ہے۔

- www.giveupriba.com انسدادِ سود کی کوششوں کے ضمن میں جملہ معلومات، تاریخی پس منظر، عدالتی فیصلے، قرآن وسنت کے حوالہ جات، معروف تفاسیر کے اقتباسات اور شرق وغرب کے نامور مفکرین کے اقوال وتحریرات اس ویب سائٹ پر دستیاب ہیں۔

- www.hafizahmadyar.com پروفیسر حافظ احمد یارؒ (سابق مدرس پنجاب یونیورسٹی وقرآن اکیڈمی لاہور) کا علمی خزانہ، قرآن مجید کی صرفی ونحوی ترکیب، بلاغتِ قرآن وآڈیو تفسیرِ قرآن اس ویب سائٹ پر دستیاب ہیں۔

Feb 2019
Vol.68
Regd. CPL No.115
No.2
Monthly Meesaq Lahore